حسنِ تاثیر لبِ زمزمہ پرداز میں ہے
نغمہ ہر رنگ کا خوابیدہ مرے ساز میں ہے

مطلعِ انوار

منظومات مہاراج بہادر برق دہلوی
بی اے منشی فاضل

پہلا ایڈیشن قیمت عہ

مطبوعہ جید المطابع برقی پریس دہلی میں مرزا محمد بیگ کے اہتمام سے چھپا

مقدمہ

از

جناب چودھری جگت موہن لال صاحب رواںؔ ایم۔ اے ایل ایل۔ بی

مصنف "روح رواں"

جب مجھ سے میرے مکرم دوست برقؔ دہلوی نے اپنی نظموں کے مجموعہ پر مقدمہ لکھنے کے لیئے کہا تو میں نے بہت تعجب کیا، تعجب اس لیئے کہ انہوں نے اتنی بڑی خدمت سے مجھ ہیچمیرز کو سرفراز کرنا کیونکر مناسب سمجھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ میں اس ذمہ داری سے کیونکر عہدہ برآ ہونگا لیکن چونکہ ایک دوست کی فرمائش تھی اسے اپنے لیے مایۂ ناز سمجھکر اس پر کاربند ہونا ہی اپنا فرض تصور کیا لیکن اس کا مجھے اعتراف ہے کہ ان جواہر پاروں کی داد مجھ سا بے مایہ نہ دے سکتا تھا نہ دے سکا۔

اس سے قبل کہ میں جناب برقؔ دہلوی کے کلام پر تبصرہ کروں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بسبیل تذکرہ ناظرین سے ان کا تعارف کرا دیا جائے۔

تعارف جناب برقؔ دہلوی یعنی منشی مہاراج بہادر صاحب برقؔ ماہ جولائی سنہ ۱۹۰۰ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد کا قدیم وطن سکیٹ ضلع ایٹہ ہے۔ خاندان کے مورث اعلیٰ رائے جگر دیپ بہادر تھے جو ایٹہ کے مایۂ ناز بزرگوں میں سمجھے جاتے تھے کئی پشت

سے آپ کے بزرگ دہلی میں متوطن ہیں اور شاہی زمانے میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز رہ چکے ہیں آپ کے دادا منشی خوب چند صاحب آخری دورِ شاہی میں شاہی وکیل تھے۔ آپ کے والد منشی ہرنرائن صاحب حسرتؔ ایک خوش فکر شاعر تھے۔ آپ کے نانا رائے دولت رام صاحب "عبرتؔ" جو راجہ کنول نین کے خاندان کے ایک رکن تھے۔ ادیب فاضل۔ شاعر بلند پایہ۔ صاحبِ دیوان اور خاقانیِ ہند استاد ذوقؔ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ پرانے تذکروں میں ان کے حالات و اشعار ملتے ہیں۔ اس طرح اگر بقول حکیم اسد علی خاں صاحب مضطرؔ دہلوی یہ کہا جائے کہ شاعری آپ کو ایک معقول میں ورثہ میں ملی ہے تو غلط نہ ہوگا۔

شاعری کا شوق شعر و سخن سے آپ کی طبیعت کو فطری مناسبت اور اس فنِ لطیف کا قدرتی ذوق ہے۔ اوائل عمر ہی میں آپ کی طبیعت اس طرف مائل تھی۔ بچپن ہی میں جناب "عبرتؔ" و دیگر مشاہیرِ سخن کے صدہا اشعار آپ کے نوکِ زباں تھے۔ اور اشعار پڑھنے اور سننے سے ایک کیفیتِ سرور حاصل ہوتا تھا۔ بچپن ہی میں خداداد موزونیِ طبع کے جوہر نمایاں ہونے لگے تھے۔

پہلا شعر اور اُس کی شانِ نزول ابتدائے سنِ شعور کا زمانہ تھا۔ آپ کی آنکھیں دُکھتی تھیں۔ ایک دوست نے پوچھا۔ کہو کیا حال ہے۔ بیساختہ آپ کی زبان سے یہ شعر نکلا:۔ ؎

دل تو آتا تھا مگر اب آنکھ بھی آنے لگی　　پختہ کاریِ عشق کی یہ رنگ دکھلانے لگی

اس قسم کی حاضر طبعی کی کتنی ہی مثالیں ہیں جو بخوف طوالت مضمون نظر انداز کرتا ہوں۔

والدین کی ہمت افزائی جب آپ کے والد بزرگوار کو آپ کی موزونی طبع اور شعر گوئی کا علم ہوا تو دل میں بیحد خوش ہوئے لیکن تعلیم میں ہرج ہونے کے خیال سے آپ کو فکرِ سخن سے باز رکھا۔ اس جگہ یہ لکھنا بھی شاید ضروری ہے کہ اُس زمانہ میں اردو شاعری تذکرات حسن و بیانِ وارداتِ عشق تک محدود سمجھی جاتی تھی اور فطرت نگارانِ دورِ حاضرہ کا آفتاب شہرت بلند نہ ہوا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں جب آپ نے انٹرنس پاس کر لیا تو کبھی کبھی دلی کے مشاعروں میں شرکت کی اجازت ملنے لگی۔

ماہ فروری ۱۹۰۶ء میں شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ایک کوہِ الم ٹوٹ پڑا تعلیم ناتمام رہ گئی اور حوادثِ زمانہ سے مجبور ہو کر آپ کو سلسلۂ ملازمت میں پابند ہونا پڑا۔ تعلیم ناتمام رہ جانے کا آپ کو بیحد ملال رہا اور اکتسابِ علم کا شوق آتشِ خس پوش کی طرح دل میں دبا رہا۔ بالآخر موقع ہاتھ آنے پر ۱۹۱۸ء میں آپ نے منشی فاضل (آنرز ان پرشین) کا امتحان پاس کیا۔ دوسرے سال ایف۔ اے اور ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ بعد ازاں ۱۹۲۲ء میں سب آرڈینیٹ اکاونٹ سروس کے ڈیپارٹمنٹل امتحان میں کامیابی حاصل کی اور اب پوسٹل آڈٹ آفس دہلی میں سپرنٹنڈنٹ (.Superintendent) کے جلیل القدر عہدہ پر مامور و ممتاز ہیں۔ ملازمت آپ کے لئے ایک فریضہ ہے ناگزیر، ورنہ آپکا اصلی

رجحانِ طبیعت شعر و سخن اور مطالعۂ کتب کی جانب ہے۔

اخلاق و عادات آپ کے حُسنِ اخلاق کے متعلّق میں صرف منشی تلوک چند صاحب محرومؔ کے دو شعر درج ذیل کر دینا کافی سمجھتا ہوں:-

برنگِ آہ کھنچ کر برق کی جانب گئے دہلی | کہ اُن کو جذبِ اُلفت میں مثالِ کہربا دیکھا
دلِ محرومؔ نازاں ہے کہ جن سے اٹھتی اُٹھکو | اُنہیں سرتا قدم مجموعۂ صدق و صفا دیکھا

ابتدائی زمانہ میں آپ نے نواب فصیح الملک بہادر داغؔ دہلوی کے ایما سے جن سے اولاً رجوع کیا تھا کچھ غزلیں افسر الشعرا جناب آغا شاعر صاحب قزلباش دہلوی کو دکھائیں اور ان سے استفادۂ سخن کیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وُسعت مرے بیاں کے لیے (غالبؔ)

کے مصداق آپ کی طبیعت غزل گوئی کی بہ نسبت ادبی۔ اخلاقی اور نیچرل نظموں کی جانب زیادہ مائل ہوئی۔

پہلی نظم آپ کی سب سے پہلی نظم "عملِ خیر" کے عنوان سے (جو اس مجموعہ میں "کارِ خیر" کی سُرخی سے صفحہ ۷۹ پر درج ہے) جنوری ۱۹۱۰ء میں رسالہ "زبان" دہلی میں شائع ہوئی جو بہت پسند کی گئی اور آج تک مقبولِ عام ہے۔ اس نظم کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک صحیح دیباچہ ہے آئندہ

کے صفحات زرّیں اور کارنامۂ شاعری کا حُسنِ بیاں اور زورِ طبیعت قابلِ داد ہے۔ پُوچھنے والا خود اپنے سے یا دوسرے انسان سے سوال کرتا ہے کہ اس دنیا میں آکر تونے کیا کیا۔ سوال کو بدل بدل کے پوچھا ہے اور اس طرح پر بحید جدت کے ساتھ کارِ خیر کے مختلف محمود و طریقے دائرۂ بیاں میں آگئے ہیں۔ اکثر اشعار برجستہ اور قابلِ ستائش ہیں لیکن ان سب کا یہاں درج کرنا طوالت سے خالی نہ ہوگا۔ صرف ایک بند ملاحظہ ہو۔ اور بہت سی باتیں پوچھتے پوچھتے سوال ہوتا ہے:۔

شریکِ دردِ دل ہو کر کسی کا دُکھ بٹایا ہے مُصیبت میں کسی آفت زدہ کے کام آیا ہے
پرائی آگ میں پڑکر کبھی دل بھی جلایا ہے کسی بیکس کی خاطر جان پر صدمہ اُٹھایا ہے
کبھی آنسو بہائے ہیں کسی کی بدنصیبی پر
کبھی دل تیرا بھر آیا ہے مُفلس کی غریبی پر

کتنا اچھا معیارِ حیات ہے اور کیسی سچّی بات۔ واقعی انسان کا دُنیا میں آنا بیکار اور محض بیکار ہے اگر اس نے کمزوروں کی مدد اور بقول جناب برق:۔

"کبھی کچھ "چارہ فرمائی" نہ کی زخمی و خستہ کی"

اسکے بعد آپ کو نظم لکھنے سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی دلاویز نظمیں اُردو کے بہترین رسائل و جرائد ادیب، زمانہ، العصر، زبان، مخزن وغیرہ میں

شائع ہونے لگیں اور آپ کا مشاہیر میں شمار ہونے لگا۔ ایک خاص بات یہاں قابلِ ذکر یہ ہے کہ نیچرل نظمیں لکھنے سے آپ کے ذوقِ غزلگوئی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ یہ مذاقِ سخن اپنی جگہ پہ جذباتِ حسن وعشق کے اظہار کا ذریعہ رہا چنانچہ غزلوں کا دیوان بھی تقریباً مکمل ہے جو عنقریب "تجلیاتِ برق" کے نام سے شائع ہوگا۔

اِس مجموعہ میں آپ کے سامنے زیادہ تر وہ نظمیں ہیں جنکا تعلق مظاہرِ فطرت یا اخلاقیات سے ہے یا اِن میں مذہبی رنگ کے ساتھ ساتھ عام دلچسپی کا ایسا پہلو نمایاں ہے کہ ہر مذہب وملت ہر طبقہ وفرقہ کا آدمی ان میں ذوقِ ادب اور دلکشی کا کافی سامان پائیگا۔

میں اِس مقدمہ میں اس عام کمزوری سے اپنے کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں کہ اساتذۂ ماضی یا اور دیگر مقتدر ہستیوں کی منقصت کروں یا جناب برق دہلوی کی نسبت اپنی محبت اور عقیدتمندی کو اس قدر کام میں لاؤں کہ غیر معمولی اور جانبدارانہ ستائش کا مجرم سمجھا جاؤں۔ کوشش کروں گا کہ جناب برق کے کلام کی خصوصیات منصفانہ پیرایہ میں بیان کروں اور بس۔ اُن کا پایہ دوسرے شعرائے ماضی وحال سے موازنہ کرنے پر کیا قرار پائیگا اس کی بابت اپنی رائے نہیں ظاہر کرنا چاہتا۔ اسے اربابِ ذوق خود طے کرینگے اور کوئی طے کرے یا نہیں زمانہ خود ہر عمل کا نقاد اور صحیح معنوں میں جوہری ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قدما سے موازنہ کرنے میں بجائے خود ایک بہت بڑا اندیشہ حائل ہوتا ہے

وہ یہ کہ تعظیم ہمارے احساس تنقید پہ غالب آجاتی ہے اور ہم اپنے پیشروؤں کے لیئے انکی صحیح جگہ انتخاب کرنے سے عموماً قاصر رہتے ہیں۔ ہم کو انکے محاسن نظر آتے ہیں لیکن معائب ہماری تعظیم میں گم ہوجاتے ہیں۔

غزلگو شعرا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اُردو کی شاعری کا مخزن اور مخرجِ تخیئلی اور زبانی بیچ بھاشا ہے جس پر کثرت سے فارسی کا رنگ غالب ہے کہیں کہیں عربی کی چاشنی بھی ہے لیکن چونکہ عموماً لوگ زبانِ عربی سے صرف روشناس ہوتے ہیں اس کے نکات و محاسن سے صرف چند خوش قسمت ہی واقف ہوتے ہیں اس لیئے بالعموم اُردو غزل میں ہندی اور فارسی ہی کا اجتماع نظر آتا ہے۔ ذاتی جذبات بھی شاعر کے بقدر ظرف و امکان اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

میر کے جذبات اور بلند تخئیل نے اُردو زبان میں وہ درجہ حاصل کیا جو اب کسی دوسرے شاعر کو شاید ہی نصیب ہو اس کے کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو وہ لچکدار میٹھی سُریلی زبان ہی مفقود ہوتی جاتی ہے اب شاید حسن تحریر و تقریر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بڑے بڑے ثقیل الفاظ عبارت و شعر میں بھر دیے جائیں خواہ وہ بے محل ہی کیوں نہ ہوں ؎

وہ صحبتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں　　اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

کیا آجکل کی دشوار اُردو میں یہ لطافت کسی طرح بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔ اِس سے میرا مفہوم نہیں ہے کہ زبان اسی پُرانے انداز و پیمانے پر لفبند قائم رکھی جائے ترمیم و تنسیخ ہی نہ ہو لیکن میں اس

نئی موجِ تجدید کے خلاف ضرور ہوں۔

میر کی زبان اور جذبات کا ذکر زبانِ اُردو کی رفعت بیان کرنے کے لیے نامکمل ہوگا اگر اسی سانس میں غالب کی تخئیل کا تذکرہ نہ کردیا جائے۔ چونکہ شعر شاعر کے قلب کا آئینہ بردار ہوتا ہے اور شاعر اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اس لیے تمام دُنیا کی تاریخ شاید اشعار کی ارتقائی منزلوں سے بآسانی لکھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اپنے محور سے ہٹ کر اور اپنے گرد و پیش کی کیفیتوں سے بلند تر ہو کر شعر کہنا صرف انہی چند ہستیوں کا حصّہ ہے جنکا شُمار ملکی شاعروں کی صف سے بلند تر ہو کر شعرائے عالم کی ذیل میں آجاتا ہے۔ المختصر غالب نے اپنی تخئیل کو آسمان پر پہنچا دیا۔ کچھ تو اس کا کثرت مطالعہ اور کچھ اس کی غیور اور بے حد جدت طراز طبیعت اس کی ذمہ دار ہے۔ کبھی کبھی ہم صاف محسوس کرتے ہیں کہ خیالات کا ایک سمندر اس کے دل میں موجیں مار رہا ہے۔ اپنے قلب کے احساسات کو بیان کردینا چاہتا ہے لیکن نہ غزل کی محدود کائنات اسکے تخیل و جذبات کی حامل بن سکتی ہے نہ اُردو زبان اس کے خیالات کو صحیح اور جامع طور پر ادا کرسکتی ہے۔ دُور کیوں جائیے اس کی پہلی غزل کا پہلا شعر جو دیوانِ مطبوعہ میں ملتا ہے اسی کو لیجئے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مجھے تو اس شعر میں خود خیال "فریادی" نظر آتا ہے کہ کہیں پورے طور پر ادا نہیں ہوا۔ اور زبان

فریادی نظر آتی ہے کہ میں غالب کے تخیل کی بطرز حسن آئینہ برداری نہ کر سکی۔ اب معنی کی ٹھوس ٹھانس دوسری چیز ہے۔ نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ خود غالب کو یہ کمی محسوس ہوئی اور اُس نے عین لاچاری کی حالت میں آواز بلند کی :-

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وُسعت مرے بیاں کے لیئے

یا جیسا میں نے ایک غزل کے مقطع میں عرض کیا تھا

ایسے بھی کچھ نالہائے قلبِ مضطر ہیں وہاں
جو فضائے آسماں میں حشر تک گونجا کریں

غالب کا نالہ قلبِ مُضطر برابر فضائے آسمان میں گونجتا رہا۔ اسکے بعد اُردو شاعری شاہانِ اودھ کے آخری زمانہ میں بیحد پستی و بدمذاقی کا شکار ہوگئی اور ہم صاف طور سے دیکھتے ہیں کہ آج تک اِس قعرِ تذلیل سے پورے طور پر نکل نہیں سکی۔

نیا اسکولِ شعر مُلکی حالات کا ایک لازمی نتیجہ سمجھیئے یا اُردو شاعری کی خوش قسمتی کہ انگریزی زبان کی ترویج کے ساتھ اُردو شاعری میں بھی ایک نیا دَور شروع ہوا۔ زبان میں نئے خیالات داخل ہونے لگے اور انگریزی ماہرانِ فن کیٹس اور شیلی۔ ورڈز ورتھ اور ٹنی سن کے معجزات شعر ہمارے سامنے آئے اور فطرتِ انسانی کے تقاضے کے بموجب ہم میں ایک آرزو پیدا ہوئی کہ

ہماری زبان کا دامن بھی ان موتیوں سے بھرا جائے۔ خاکے ہمارے سامنے آ گئے تو ہندوستان ایسے ملک میں جہاں غزل میں جذباتِ حسن و عشق سماتے نہ تھے اور فطرت اپنی رنگین چادر ہر طرف پھیلائے ہوئے ہے۔ اشعار کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ نئے نئے شاعروں نے نئے نئے انداز سے شعر لکھنا شروع کیا اور اُفقِ اُردو پر ایک نئے رنگ کی بہار نظر آنے لگی۔ احسان فراموشی ہوگی اگر اس موقع پر جناب برقؔ دہلوی کے پیشروانِ ماضی و حال میں سے چند کا ذکر اس موقع پر نہ کر دیا جائے۔

مجتہدانِ عصرِ جدید حالیؔ و آزادؔ کے بعد نادرؔ کاکوروی اور سرورؔ جہان آبادی کا نام بے ساختہ ہماری زبان پر آجاتا ہے۔ حالیؔ نے اپنی زبان سے قدیم طرزِ غزلگوئی کی دل کھول کر مذمت کی اور اپنے ہمعصروں پر اس کا اثر قائم کر دیا محض الفاظ کے گورکھ دھندے بنانے کے خلاف اس نے ایک صدائے احتجاج بلند کی اور وہ صدا خدا کا شکر ہے کہ جن کانوں میں پہنچنا چاہیے تھی اُن میں پہنچے بغیر نہ رہی جب حالیؔ کہتا ہے اور اسی پستی کے زمانے کی شاعری کے متعلق کہتا ہے کہ ؎

حالیؔ اب آؤ پیرویِ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفیؔ و میرؔ کر چکے

تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ایک حساس دل جل رہا ہے اور ہم اس کے اثر سے بےچین ہو جاتے

ہیں۔ غزل سے نفرت یا بے تعلقی تو جب تک مشرقی شاعری زندہ ہے ناممکن ہے اور مناسب بھی نہیں۔ البتہ غزل کے علاوہ دوسری اصناف شعر کی جانب رغبت اس ترمیم و تجدید کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور وہ نادر کاکوروی کی نظموں میں بخوبی ظاہر ہوا سرور جہان آبادی۔ اکبر۔ اقبال و محروم نے کافی دادِ سخن دی۔

آزاد کی رکھی ہوئی بُنیاد کو حالی نے کسی قدر بلند کیا اور اگر براہِ راست حالی کو مغرب کے اساتذہ کا کلام دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوتا تو مولینا حالی یقیناً بہترین نظم لکھنے پر قادر ہو جاتے اس پر بھی حالی کی شاعری سے جو گرانقدر اضافہ اُردو ادب میں ہوا وہ قابل صد آفرین ہے اور جب کبھی حالی ان بندشوں سے آزاد ہو کر شعر کہتے ہیں تو ان کا صحیح جذبہ جھلک اُٹھتا ہے اور ان کی رُوح خود ان کی ہمت پر وجد کرتی ہے جیسے اُن کی مشہور نظم "چُپ کی داد" ہے لیکن ان پیشقدم شعرا میں جنھوں نے پہلے پہل غزل کے خلاف صدائے احتجاج بلند بلند کی اور نئے دَور کا خیر مقدم کیا حالی کا نمبر اوّل ہے۔

حالی کے پیشرو آزاد نے بھی اس قسم کی محمود کوششیں کیں اور خود بھی اس صنف شعر کی ترقی میں بہت کام کیا لیکن وہ نثر لکھنے کے لیے فطرتاً زیادہ موزوں تھے اور ان کی نثر نظم پر فوقیت رکھتی ہے۔ کہیں کہیں البتہ "مثنوی خواب امن" اور مثنوی "شب قدر" میں ہم آزاد کی شاعری کا سچا جوہر دیکھتے ہیں۔

اب یہ زمانہ آیا کہ محض ذاتی مفاد اور ضمنی ترقیوں کے علاوہ شعرا کی نظر مجموعی حیثیت سے عوام اور ملکی بہبود کی طرف پھری۔ اُدھر مغرب کی شاعری زیادہ داخلِ مزاج ہونے لگی شعرا کو یہ احساس ہونے لگا کہ انکے ذاتی۔ قومی۔ ملکی۔ فطری جذبات کے اظہار کے لئے کسی دور اُفتادہ عنوان کے بجائے معمولی روزمرّہ کے عنوانات پر لکھنے میں زیادہ گنجائش ہے۔ ان کی تخئیل میں وسعت پیدا ہوئی اور وہ اپنی شاعرانہ نگاہ معمولی چیزوں پر بھی ہمدردی سے ڈالنے لگے۔

اس کیفیت کا بہترین نظارہ ہم کو سرور جہان آبادی کی نظموں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ سرور کی شاعری بیانیہ ہونے کے علاوہ دلی جذبات کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ملکی بہبود کا احساس اسکی نظموں میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس کے مجموعہ میں ہم کو زیادہ تعداد ایسی نظموں کی ملتی ہے جنمیں قومی جذبات کی روشنی ہے "خاک وطن" کے عنوان سے جو نظم سرور نے لکھی ہے اس میں شاعر نے اپنا کلیجہ نکال کر کاغذ پر رکھدیا ہے۔ ذرا سُنیئے:-

آہ۔ اے خاکِ وطن اے دردمند و بیقرار
آہ۔ اے شوریدہ قسمت لے پریشاں روزگار

اُڑ رہا تھا پرچمِ شوکت ترا افلاک پر
سرنگوں ہے تیری عظمت کا نشاں اب خاک پر

جھلملا کر بجھ گئے سب تیرے ایواں کے چراغ
ہیں جگر کے داغ اب تیرے شبستاں کے چراغ

اُڑ گیا نورِ سحر تاریکیِ غم چھا گئی
نیرِّ اقبال ڈوبا۔ شامِ ماتم چھا گئی

اس بیچرل تصویر کشی اور جذبات نگاری حب وطن اور آزاد نویسی کے لیئے ہم نادر کاکوروی کے احسانمند ہیں۔ مقدس سرزمین ۔ نادرِ ہند ۔ شعاعِ امید میں ہم انہی جذبات کو نمایاں طریقہ سے عکس پذیر پاتے ہیں۔ شمع و پروانہ نادر کاکوروی کی ایک یادگار نظم ہے (افسوس ہے کہ اس یکتائے عصر کی جیسی کچھ قدر ہونی چاہیئے تھی نہیں ہوئی اور ہم اس کو جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے بھولتے جاتے ہیں) یہانتک کہ نادر کی ندرت ۔ سرور کی حبِّ وطن اور محزن نگاری ۔ حالی کا جذبۂ قومی ۔ آزاد کی اردو پرستی سب آکر ایک شخص واحد میں جمع ہوجاتی ہیں۔ اور اکبر کا نام اس تمہید سے ہماری زبان پر بے ساختہ آجاتا ہے۔ اکبر نے جو خاص رنگ اپنے جذبات و احساسات کو ظاہر کرنے اور مقبول بنانے کے لیئے انتخاب کیا وہ قابلِ صد تحسین ہے۔

اقبال اِس دورِ جدید کے بلند پایہ سخنور ہیں۔ اقبال کا انتخاب الفاظ ۔ قوت نظم سادگی ۔ جدت طرازی ۔ شدتِ حس اور جذبات نگاری انہیں اپنے پیشرووں اور معاصرینا سے کسی قدر ممتاز کرتی ہے۔ اقبال ۔ محروم اور تسکین ۔ اختر اور شوق قدوائی ۔ شاد حیدرآبادی ۔ چکبست لکھنوی اور عزیز لکھنوی سے جو سلکِ مروارید مرتب ہوتی ہے اُسی کے ایک درخشندہ گوہر جناب برق دہلوی ہیں۔ افسوس کہ اس مختصر مقدمہ میں ان تمام پیشروان و معاصرین برق دہلوی کے کلام کا وضاحت کے ساتھ تذکرہ نہیں کیا جا سکتا لیکن

جیسا آئندہ ذکر آئیگا جناب برق کی نظر اُسی طرح وسیع اور ہمہ گیر، کلام میں وہی زور اور تاثیر ہے۔ وہ کسی ایک موضوع پر نہیں لکھتے بلکہ بھونرے کی طرح مختلف پھولوں کا رس لیتے ہیں۔ کبھی چاند ستارے۔ دریا۔ صبح۔ شام۔ ان کے دل کے جذبات کو متحرک کرتے ہیں اور وہ اپنے صحیح اور سچے جذبات صاف مؤثر اور پاکیزہ زبان میں ادا کرتے ہیں۔ کبھی بے ثباتی دُنیا انہیں بے چین کرتی ہے اور وہ اپنے خیالات شاعرانہ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ کبھی ہندو مذہب کی عظمت ان سے سادہ اور پُرکیف انداز میں خراجِ تحسین وصول کرتی ہے۔ کبھی وہ مغربی تخیّل اور جذبات سے اپنے ادب کے دامن کو مالا مال کرنے کی فکر ترجموں میں کرتے ہیں۔ کبھی دورِ ماضی کی برکتوں اور خوبیوں کو مقراضِ تجدید سے بچانے کی خواہش میں صدائے درد بلند کرتے ہیں۔ کبھی موجودہ دَور کی بُرائیوں سے برگشتہ ہو کر تحقیق و ترمیم کی صلاح اپنے کلام میں دیتے ہیں۔ اُن کی نظر بے حد وسیع۔ ان کی طبیعت دردمند اور دل احساسات سے لبریز ہے۔ ان کی مذہبی نظموں میں بھی کہیں تعصّب۔ تنگ خیالی اور کوتاہ نظری کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

اِس مجموعہ میں جناب برق نے پانچ طرح کی نظمیں شامل کی ہیں۔

۱: نیچرل نظمیں جو طبعزاد ہیں۔

۲: نظمیں جو دوسری زبان سے اُردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔

۳: مذہبی نظمیں۔

۴:۔ نظمیں جن کا تعلق دورِ ماضی یا تاریخ سے ہے ۔

۵:۔ نظمیں جن کا تعلق زمانۂ حال یا کسی اصلاحِ عمل سے ہے ۔

نیچرل نظمیں ان نظموں کی فہرست پھر دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ۔ اول وہ نظمیں جنمیں محض کسی کرشمۂ قدرت پر توجہ کی گئی ہے ۔ دوسری وہ نظمیں جنمیں شاعر نے اپنے جذبات کا اظہار کسی خاص عنوان سے کیا ہے ۔ مثلاً "ہجوم یاس" "صبح امید" "مٹی کا چراغ" "سبزۂ بیگانہ" "کارِ خیر" "دلِ درد آشنا" "ہمہ اوست" "راضی برضا" صنفِ اول کی نظمیں بہ نسبت صنفِ دوم کے بہت زیادہ ہیں ۔ مثلاً "حسنِ فطرت" "ستارۂ صبح" "جلوۂ سحر" "کرمکِ شب تاب" "شفق" "بہارِ شفق" "بسنت رت" "تارے" "تاروں بھری رات" "ماہِ تاباں" "شبِ ماہتاب" "بہارِ بسنت" "برسات کی شام" "جوشِ بہار" "برسات اور مناظرِ کوہ" "عروسِ کوہسار" "سرس کے پھول" "ٹیسو کے پھول" "قوسِ قزح" "چمپے کی کلیاں" وغیرہ ۔

ترجمے اس صنف میں "ادائے شکر" "نغمۂ فطرت" "بوئے خویش" "عروسِ مرگ" "ساعتِ سفر" "شہیدِ جفا" "روحِ فلسفہ" "ساعتِ مرگ" "نشۂ حسن" "مادرِ ناشاد کا خواب" "پھول" وغیرہ شامل ہیں ۔

مذہبی نظمیں اس ذیل میں "گنگا جی" "بانسری" "کرشن بھگوان" "پدمنی کا جوہر"

"میراں بائی" "پریم کا تحفہ" "شکتی بان" "دسہرہ" "دیپ مالا" "بن باسیوں کی وطن میں آمد" "گرونانک" "کرشن سداماں" "فلسفہ گیتا" وغیرہ ہیں۔

نظمیں جن کا تعلق دورِ ماضی یا تاریخ سے ہے

مثلاً "تاج" "ہندوستان جنت نشان" "اہلِ ہند" "تیغ ہندی" "راجکماری پتا" "زیب النسا کی قبر" وغیرہ وغیرہ۔

نظمیں جنکا تعلق دورِ حال یا کسی اصلاحی نقطہ سے ہے

مثلاً "اچھوتوں سے نفرت فضول ہے" "نالۂ بیوہ" "یتیموں کی فریاد" "مشاہیر نظم اردو" وغیرہ

سب سے پہلے ہم نیچرل نظموں کی خصوصیات اور خوبیوں کا مختصراً تذکرہ کرینگے۔ نیچرل اور مجموعی طور پر شاعری کو صحیح کسوٹی پر جانچنے کے لیے ہم کو دیکھنا ہوگا کہ آیا نظم میں

۱:۔ صفائی بندش اور انتخاب الفاظ و تشبیہات و استعارات کیسا ہے۔

۲:۔ کیا شاعر نے حقیقت نگاری اور اسرار حیات کی آئینہ برداری کی ہے۔

۳:۔ کیا اس کا اندازِ بیاں حشو و زوائد سے پاک ہے۔

۴:۔ کیا اس کی نظم آسان مترنم اور بے تکلف ہے۔

۵:۔ کیا نظم میں جوشِ بیاں اور جذبات نگاری کی کافی روشنی موجود ہے۔

۶:۔ کیا جو کچھ کہا گیا ہے وہ محسوس بھی کیا گیا ہے اور دل کے احساسات دل کی زبان میں ادا ہوئے ہیں۔

۷:۔ کیا شاعر نے خود اپنے اور خاص اپنے جذبات ادا کیے ہیں یا دوسروں کے سرمایہ کا رہینِ منت ہے۔ کیا اس کی نظر کافی نکتہ رس ہے۔

۸:۔ کیا مجموعی طور پر شاعر نے دلآویز۔ دلچسپ و پُر کیف مجسمۂ نظم پیش کیا ہے یا محض الفاظ کا گورکھ دھندا مصنوعی طور پر تیار کیا ہے۔

میں نے جناب برق کی نظموں کو اسی کسوٹی پہ جانچا ہے اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ میں نے ہمیشہ ان کے کلام کو فصیح، بے تکلف اور پُرکیف پایا ہے۔ رہی زبان تو اسکا کہنا ہی کیا۔ جناب برق کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے اور محاورات ہمیشہ ستھرے اور مکمل انداز سے نظم ہوئے ہیں چستی بندش اور جدّتِ ادائے بیاں آپ کا حصّہ ہے۔

نثر میں جن ضروریاتِ شعر کا میں نے یہاں ذکر کیا ہے ان کو کچھ عرصہ ہوا ایک نظم کا جامہ پہنایا تھا اور شاید قابلِ معافی ہو گا اگر میں اس نظم کے چند متعلقہ بند یہاں پیش کروں:۔

شاعری کیا ہے اک احساسِ قوانینِ وجود　　　دل کے جذبات کا اظہار بتائیدِ قیود
برہمن ہے دلِ شاعر بُتِ فطرت معبود　　　جلوہ پیرائے ازل کا ہے یہاں حُسنِ نمود
جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے

دل کے آئینہ پہ تصویر اُتر آتی ہے

دل ہے شاعر کا کہ اک منزلِ انوارِ جمال اور جولانگہِ دل وسعتِ میدانِ خیال

نغمہ زن ہوتا ہے جب مستِ سخن صاحبِ قال بزمِ فطرت میں ہر اک چیز کو آجاتا ہے حال

کوہ جھک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے

چشمے رُک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے

وغیرہ وغیرہ (ملاحظہ ہو "روحِ رواں" صفحہ ۵۴)

اس کے بعد میں کوشش کروں گا کہ اس دعوے کی تائید جناب برقؔ دہلوی کے کلام میں مثالوں کے ذریعہ سے کروں۔

"حُسنِ فطرت" کے عنوان سے جو نظم جناب برقؔ نے لکھی ہے اسکو پڑھئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی نظر کی توسیع کیلئے زمین و آسمان دونوں کم پڑتے ہیں۔ زمین کا ذرہ ذرہ آسمان کا ستارہ ستارہ۔ تمام صبح و شام کے مناظر اور انکے انسان کے دل اور انسان کی رُوح سے تعلقات یہ سب شاعر کی نگاہوں میں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُسکی نظر اُن سب از کے پردوں سے گزر کر خالقِ جُزو کل کا عکس لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ شدتِ احساس الفاظ سے پھُوٹی نکلتی ہے اور الفاظ جذبات کو کافی طور پر ادا کرنے کیلئے بےچین ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

اِک جلوہ گہِ حُسن ہے یہ عالمِ اسباب　　نظّارہ بداماں ہے رُخِ مہرِ جہاں تاب
ہے چادرِ مہتاب کہ اک نُور کا سیلاب　　ہر اختر تابندہ ہے رشکِ دُرِ نایاب
ہے وُسعتِ دامانِ خلا حُسن سے لبریز
آنکھیں ہوں تو ہیں ارض و سما حُسن سے لبریز

معمُور لطافت سے ہے دنیائے نباتات　　ہر گُل میں نئی بُو ہے نیا رنگ نئی بات
ہر پیکرِ تصویر میں ہیں حُسن کے ذرّات　　نیرنگیِ جلوہ ہے اسی شئے کی کرامات
ہر نقشِ دلآویز ہے قُدرت کا مُرقّع
اعجازِ قلمکاریِ قُدرت کا مُرقّع

پُوری نظم کی تشریح کے لیئے ایک دفتر درکار ہے۔ انہی دو بندوں کو دیکھئے۔ پہلے مصرع میں شاعر نے آئندہ تشریح کی کتنی اچھی تمہید کی ہے۔ عالمِ اسباب کہکر شاعر نے اپنے دائرۂ تخئیل میں ارض و سما۔ خلائے بالا۔ دامانِ فضا۔ عالمِ نباتات۔ ستارہ اور ماہتاب غرضکہ ذرّہ سے لیکر آفتاب تک سب کچھ لے لیا اور کس قدر نیچرل طریقہ سے پہلے آسمان سے شروع کیا ہے اور آسمان پر بھی سب سے زیادہ منوّر اور سب سے زیادہ فیّاض ہستی کا ذکر سب سے پہلے کیا ہے۔ اسکے بعد ماہتاب کا ذکر ہے پھر اس کے بعد ستاروں کا۔ ان مستعد ہستیوں کے

بعد زمین تک آتے آتے جو "دامانِ خلا" پیش نظر ہوتا ہے اس کا تذکرہ ہے اور کس قدر فصیح انداز میں "حسن سے لبریز" جیسے مختصر الفاظ سے اس کی پوری کیفیت بیان کردی گئی ہے۔ ٹیپ کے شعر کے دوسرے مصرع میں پوری قید عائد کردی گئی کہ یہ سب کچھ ہے لیکن اس کے لیۓ لازم ہے کہ انسان کی نگاہ بینا ہو ورنہ یہ سب ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے۔

اب مختلف مصرعوں کی سجاوٹ ملاحظہ ہو۔ "جلوہ گہ حسن" کی تشریح میں پوری نظم صرف کی گئی ہے۔ چادرِ مہتاب کو نور کا سیلاب کہنا کس درجہ لطیف تخیل ہے۔ پورے چاند کو اور اس کی روشنی کو عالم پر پھیلا ہوا خیال کیجیۓ اور پہاڑ اور دریا مکان دنیائے نباتات سب پر چاندنی کو مسلّط تصور کیجیۓ پھر اس مصرع کی لطافت کو ملاحظہ کیجیۓ۔ ع

"ہے چادرِ مہتاب کہ اک نور کا سیلاب"

اللہ اکبر۔ چاندنی کا وہ محیط تسلّط۔ وہ عالم نواز وسعت۔ وہ بہتات وہ صفائی وہ موج در موج روانی سب کچھ ایک مصرع میں۔ سیلاب کی مشابہت چادرِ نور سے کس قدر پر لطف ہے۔ دیکھی ہوئی چیزوں کی تعریف کرتے کرتے شاعر کے دل نے محسوس کیا کہ جو چیزیں عام نگاہوں کو نظر نہیں آتیں اور جن کے لیۓ "دیدۂ بینا" کی ضرورت ہے ان کی حسین فطرت کا بیان بھی ضروری ہے۔ اب آسمان اور خلا کا ذکر ہو چکا اب زمین کا ذکر

کرتے ہوئے سب سے زیادہ قابلِ دید چیز یقیناً دنیائے نباتات ہے "دنیائے نباتات" کہکر پھر شاعر نے اپنی آغوشِ تخئیل میں پہاڑ جنگل۔ باغ۔ دشت و گلزار سب کچھ لیلیا اور ایک کسی خاص چیز کا ذکر نہیں بلکہ تمام وکمال دنیائے نباتات لطافت سے معمور ہے۔ اس لطافت کے تذکرے میں یہ بات بھی لُطف سے خالی نہیں ہے کہ کہیں بھی یکرنگی تکرار یا تخلیق فضول کا جُرم فطرت پہ عائد نہیں کیا جا سکتا۔ علم نباتات کے ماہرین کیا بلکہ مُبتدی بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ چھوٹی سے چھوٹی پتی کے درخت میں بھی کوئی دو پتّیاں ایک شکل وصورت کی نہیں ہوتیں۔ یہ فطرت کی آزاد متنوع تخلیق کی ایک ادنیٰ کرشمہ کاری ہے۔ یہی بات جو سائنس کے الفاظ میں کسی دوسری طرح ادا ہوتی شاعر کی زبان سے اس طرح ادا ہوتی ہے:۔ ع

ہر گُل میں نئی بُو ہے۔ نیا رنگ۔ نئی بات

"نئی بات" کے جامع الفاظ کی داد نہیں دی جا سکتی۔ مختلف صورت مختلف ہیئت مختلف بناوٹ مختلف ڈیل ڈول ان سب باتوں کو شاعر نے دو لفظوں میں ادا کر دیا۔ یہ معجزہ شاعری ہے۔

اِن تمام باتوں کے ہوتے ہوئے سب کچھ لکھنے کے بعد پھر بھی شاعر محسوس کرتا ہے کہ انسان کی محدود و معذور نگاہ حُسنِ قُدرت کو نہ اچھی طرح دیکھ سکتی ہے۔ نہ اسکی داد دیکتی

ہے اور بالآخر کہتا ہے کہ ؎

گنجینۂ اسرار ہے معمورۂ ہستی

اِک مطلعِ انوار ہے معمورۂ ہستی

ستارۂ صبح ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے صبح کا جھلملاتا ہوا ستارہ نہ دیکھا ہو۔ اور اس کی کیفیات سے متاثر نہ ہوا ہو لیکن اِن جذبات کو صحیح اور سچے طریقہ پر ادا کرنا جناب برقؔ کا حصّہ ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:۔

تپِ الم سے ہے فق رنگِ روئے رنجیدہ ہے مانندِ صورت یاقوتِ ناتراشیدہ
سحر کے جلوے ہیں مشرق میں نیم خوابیدہ یہ ڈالتا ہے انہی پر نگاہِ دزدیدہ

پیامِ نور کے تڑکے سحر کا لایا ہے
نویدِ مقدمِ خورشید دینے آیا ہے

"جلوۂ سحر" کی نظم میں فرماتے ہیں:

تاروں کی اب کہاں ہیں وہ جلوہ نمائیاں گُل ہیں چراغ۔ مہرِ منور کے سامنے
چُھٹتی ہیں ماہتاب کے رُخ پہ ہوائیاں کیا رنگ جم سکے شہِ خاور کے سامنے

انگڑائی لیکے سبزۂ خوابیدہ جاگ اُٹھا اُترا خمارِ نرگسِ بدمستِ خواب کا

سورج مکھی کا اختر قسمت چمک گیا کھولی ہے آنکھ دیکھ کے مُنھ آفتاب کا

مصرعوں کا تناسب اور الفاظ کی نشست ملاحظہ طلب ہے۔ پہلے بند کا انداز طعنہ زنی کا ہے اور ہر مصرع میں وہی بجلی دوڑتی پھرتی ہے۔ "اب کہاں ہیں" میں کس قدر تراش ہے اور دوسرے مصرع میں گویا ستاروں کی تیرہ بختی پر مُہر لگا دی گئی ہے "گل ہیں چراغ مہرِ منوّر کے سامنے" کسی بڑی اور محیط ہستی کے سامنے چھوٹی اور زُود انجام ہستی کا چراغ جل نہیں سکتا۔ اس کو کس قدر پُر تاثیر اور زوردار الفاظ میں ادا کیا ہے۔ کہ داد نہیں دی جا سکتی۔

"گُل ہیں چراغ" اگر یہ کہا جاتا کہ چراغ جل نہیں سکتا تو محاورہ نامکمّل رہنے کے علاوہ خیال کو واقعہ کے مطابق نہ کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ رات کو ستارے نکلتے ہیں رات بھر روشن رہتے ہیں اور آفتاب نکلتے نکلتے ان کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے اور وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اِسی خیال کو "گُل ہیں چراغ" سے ادا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد "چھُٹتی ہیں ماہتاب کے رُخ پر ہوائیاں" بھی فصاحت کا ایک نایاب نمونہ ہے۔ تین مصرعوں میں جو کیفیت بیان کی گئی تھی اس کو کس خوشنما انداز سے مکمل کیا گیا ہے اور اس دعوے کے ساتھ گویا اس موضوع پر یہ آخری الفاظ ہیں۔ خوفِ تردید کا تو ذکر ہی کیا۔

"کیا رنگ جم سکے شہِ خاور کے سامنے"

کتنی سچّی بات۔ بندش کس قدر چست۔ کتنی مختصر حقیقت ہے کس قدر ہم دوش اور فطرت کی کتنی مکمل تصویر ہے۔

کرمکِ شب تاب ابتدا سے اردو میں جگنو شاعروں کا موضوعِ شعر رہ چکا ہے۔ قریب قریب نئے دور کے ہر شاعر نے جگنو پر نظم لکھکر اپنا زورِ طبیعت دکھایا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال سے لیکر اور چھوٹے سے چھوٹے نیچرل نظم لکھنے والے شاعر نے جگنو پر توجہ کی ہے۔ جنابِ برق نے بھی کرمکِ شب تاب کے عنوان سے اس فطرت کی حسین اور تعجب انگیز کرشمہ سازی پر نظم لکھی ہے۔ یہ نظم خاص طور سے قابلِ داد ہے۔ آپ الفاظ کے انتخاب میں ایک خاص بات پائینگے۔ ہر مصرع میں الفاظ روحِ تشبیہ سے دست وبغل ہیں۔ اور تشبیہات کی تلاش میں تو جنابِ برق نے قلم توڑ دیے ہیں۔ یہ نظم یکم جون ۱۹۱۸ء کو لکھی گئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب برق کو اس موضوع پر نظم لکھنے میں خاص دقتوں کا سامنا ہوا ہوگا۔ جناب برق جیسے کثیر المطالعہ سے یہ یقیناً امید کی جاسکتی ہے کہ دیگر مشاہیر کی نظمیں ان کی نگاہ سے گزر چکی ہوں گی۔ پھر دوسرے شاعروں کی تشبیہوں سے بچاکر تشبیہات تلاش کرنا ایک دشوار بات تھی لیکن جنابِ برق کا قلم کس حد تک کامیاب ہوا ہے اس کی داد اہلِ نظر نظم پڑھکر ہی دینگے۔ استعارات

وتشبیہات کا ایک دریا ہے کہ اُمنڈتا چلا آتا ہے۔ خیالات میں کس قدر پختگی۔ زبان میں کتنی سلاست اور برجستگی ہے۔ تشبیہات کی لطافت کے ساتھ ساتھ حقیقت سے ہم آغوشی قابلِ داد ہے۔ چند کا تذکرہ کافی ہوگا۔

"خندۂ جامِ بلوریں ہے ہوا میں پرّاں"

جدتِ تشبیہہ ملاحظہ ہو۔ جگنو کی چمک تھوڑی دیر رہ کر پھر ماند پڑ جاتی ہے۔ اس عارضی حسن کو "خندہ" سے تشبیہ دینا کتنی نادر مثال ہے۔ پھر خندہ اگر کسی بدشکل ہستی کا ہو تو اس کا لطیف ہونا لازم نہیں ہے۔ اس لیئے خندۂ جام کہا۔ اب خندۂ جام میں مشکل یہ تھی کہ "جام" کیلئے یہ کیا ضرور ہے کہ وہ نور آگیں بھی ہو اس لیئے خندۂ جامِ بلوریں کہا۔ سبحان اللہ۔ اب خندۂ جامِ بلوریں کی تشبیہہ ناتمام ہوتی اگر ہوا میں پرّاں نہ کہا جاتا کیونکہ جگنو اُڑتا رہتا ہے اور اسی حالت میں زیادہ دلکش ہوتا ہے۔

اس سے بھی مطمئن نہ ہوکر آگے فرماتے ہیں "آتشِ حسن کی اُڑتی ہوئی چنگاری ہے" کتنی خوب بات کہی ہے ۔

تجھ میں لے کر یکِ شتاب جھلک نور کی ہے ... چشمکِ برق سے نسبت ہے مگر دور کی ہے

جلوۂ حسن ترا پردے سے مانوس نہیں ... تو ہے وہ شمع جو شرمندۂ فانوس نہیں

ہوا اکثر شمع کو بجھا دیتی ہے لیکن کس لطف سے جنابِ برق نے اس کے متضاد خیال کو

جگنو کی خصوصیت کی طرف اشارہ کرکے ادا کیا ہے :۔

"تو ہے وہ شمع کہ ہے موجِ ہوا پر روشن"

نسیمِ صبح ایک دلکش نظم ہے جس میں ایک بیجان چیز میں اکثر مقامات شخصیت کا رنگ دیکر بحید کامیاب بنایا گیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو کس قدر پُر لطف۔ کتنا جذبہ آفریں اور معاملاتِ صحنِ گلشن کی کیسی سچی اور پاکیزہ تصویر ہے:۔

توچمن میں آئی عشقِ گُل کا دم بھرتی ہوئی چھانوں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی
پہلے آہستہ چلی اٹکھیلیاں کرتی ہوئی پھر وہی بر تیں ادائیں روز کی برتی ہوئی

گُل کو چھیڑا طرّۂ سنبل پریشاں کر دیا
غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کر دیا

یہ بند محاکات کی بہترین مثال ہے۔ خط کشیدہ مقامات کی سادگی اور نسیمِ صبح کی چالوں سے ملتی جُلتی حرکت قابلِ داد ہے۔ الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ ع

"چھانوں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی"

الفاظ کو ذرا رُک رُک کر پڑھیئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ڈر ڈر کر پاؤں رکھتا چلا آرہا ہے اور جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کی بارگاہِ ناز میں جاتے ہوئے ذرا جھجکتا ہے اسی لیئے چونکہ نسیمِ صبح عشقِ گُل کا "دم بھرتی ہوئی" آئی ہے بیباک طریقہ سے جلد جلد نہیں چلی آتی

بلکہ آہستہ آہستہ تاروں کی چھاؤں میں آتی ہے۔ جوں جوں صبح کے آثار زیادہ نمایاں ہوتے جاتے ہیں نسیم صبح بھی نسبتاً شوخ ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بیباکی اور انتہائے شوخی کیا بلکہ دست درازی کی نوبت پہنچ جاتی ہے اور یہ عالم ہوتا ہے کہ

گُل کو چھیڑا۔ طرۂ سنبل پریشاں کردیا

جسکی انتہا بالآخر یہ ہوتی ہے کہ "غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کردیا"۔

صُبح کی ہلکی روشنی میں نسیم سحر کا گلشن میں آنا اور اس کا اثر نوجوانانِ چمن و غنچہ و گُل پر اس بند میں انتہائی دلآویز پیرایہ میں بیان ہوا ہے۔

آخری بند میں نسیم سحر کی زبان سے تمام گلشن کو پیامِ صبح اس طرح سُنایا گیا ہے:۔

لے چکے انگڑائیاں بس گیسوؤں والو اُٹھو

نُور کا تڑکا ہوا۔ اے شب کے متوالو! اُٹھو

بسنت رُت پر جناب برق نے کئی نظمیں لکھی ہیں جو بجائے خود نہایت دلآویز ہیں لیکن جنوری ۱۹۲۶ء کی تاریخ میں جو نظم لکھی ہے وہ بہت ہی خوب ہے۔ اس نظم میں موسم کی خُوبیاں، اس کا وقت، دوسرے موسموں کے ساتھ اس موسم کا ربط اور مجموعی طور سے بسنت رُت کی شانِ دلاویزی بجائے دلکش اور مؤثر پیرایہ میں بیان ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

سماں یہ سرسوں کے کھیت کا ہے کہ زعفران ازکھل رہا ہے ﴿ فضا میں کُندن دمک رہا ہے سُرور آنکھوں کو مل رہا ہے

کاش ہمارے اُردو شعرا اس قسم کے موضوع پر اپنی توجہ مبذول فرماتے تو ان کو فرہاد کیساتھ کوہ کنی اور مجنوں کے ساتھ دشتِ نجد کی خاک چھاننے کی ضرورت نہ باقی رہتی۔ آگے فرماتے ہیں:۔

کھلے ہیں ٹیسو کے پھول بن میں ضیا فگن ہے شفق زمیں پر

یا:۔ کنول کے پھولوں سے ہو رہے ہیں کہیں لبِ جُو چراغ روشن

تشبیہ کی خوبی یہ ہے کہ فوراً ذہن نہ صرف موضوع مذکور کی جانب منتقل ہو جائے بلکہ وجہ تشبیہ بھی بطرزِ احسن ذہن میں آجائے۔ کیا اس سے بہتر کوئی مثال مل سکتی ہے؟

تاروں پر لکھتے ہوئے اُن تمام معلوم حالات کا بھی ذکر کرتے ہیں جنکے لیے ہم علم نجوم کے رہین منت ہیں۔

کوئی ویران ہے کوئی معمور　　کوئی تاریک کوئی بقعۂ نُور
زرد رُو کوئی صورتِ رنجور　　کوئی چشمک زنِ تجلّیِ طُور
کوئی ثابت ہے کوئی سیّارہ
محوِ حیرت ہے چشمِ نظّارہ

دوسری نظم جو "تاروں بھری رات" کے عنوان سے ہے اُس میں بھی یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے مگر کس قدر دلفریب پیرائے میں۔

تاریک کوئی، ماند کوئی، کوئی درخشاں ثابت کوئی، سیارہ کوئی، کوئی ہے رقصاں

سرگشتۂ گردش ہیں یہ دامانِ خلا میں
لاکھوں کرۂ نور معلق ہیں ہوا میں

آگے چلکر شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

ہمدم یہی غمدیدوں کے ہیں رنج و تعب میں دل ان سے بہل جاتا ہے تنہائی شب میں
گردوں پہ عجب محفلِ انجم کا ہے عالم آتا ہے نظر دور سے اک مجمعِ برہم

"شمع کشتہ" کے عنوان سے ایک بیحد دلچسپ اور معرکہ آرا نظم ہے اور جناب برق کا کارنامۂ شاعری ہے۔ بعض بعض بند تو لاجواب ہیں:۔ مثلاً

پڑ گیا پھیکا فروغِ حسنِ لاثانی ترا ملگجا سا ہو گیا ملبوسِ نورانی ترا
چھا گیا محفل میں دودِ سوزِ پنہانی ترا ڈھل گیا سانچے کی صورت نورِ پیشانی ترا

دستِ حسرت تیری حالت پر ملے گلگیر نے
رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑا حسن کی تنویر نے

شمع کشتہ کو "بیاضِ صبح" پر "اندوہ کی تفسیر" کہنا ایک اچھوتا خیال ہے۔ واقعیت سے سرشار اور حقیقت حال سے ہمدوش۔ ع۔ تو بیاضِ صبح پر اندوہ کی تفسیر ہے۔

غرضکہ ایک نہیں جملہ نیچرل نظمیں جو اس مجموعہ میں ہیں اپنے دامن میں ایک طرف

شاعری کے جواہر پارے لیے ہیں تو دوسری جانب زبان و محاورات کے صحیح کارنامے۔ ایک جانب جذباتِ فطری سے مالا مال ہیں تو دوسری طرف جدت و بلندی تخئیل کا دریا موجیں مار رہا ہے۔ ایک طرف فلسفۂ حیات کی تشریح ہے تو دوسری جانب اسرارِ حقیقت کی توضیح۔ ایک جانب قوتِ تخیل کی بہترین مثالیں ہیں تو دوسری جانب پاکیزہ تشبیہات و نادر استعارات کی عجیب و غریب تمثیلیں۔ کہیں جلوۂ فطرت نور بار ہے کہیں ہنگامۂ قدرت آشکار۔

جہاں تک دورِ جدید کے ارتقاءِ شاعری کا تعلق ہے جناب برق کی نظمیں اُردو ادب کا بہترین نمونہ ہیں۔

اب میں دوسری اصنافِ نظم کی طرف ناظرین کی توجہ دلانا چاہتا ہوں یعنی جن میں مصنف نے دیگر زبانوں سے اُردو میں ترجمے کیے ہیں۔ ایسی تیرہ نظمیں ہیں جن میں سے بعض انگریزی بعض ہندی۔ اور بعض فارسی نظموں کے ترجمے ہیں۔

ان میں سے بعض نظمیں دنیا کے بہترین شاعروں کی صف میں شہ نشین ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتانجلی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے یہ نظمیں ترجمہ کا ترجمہ ہیں۔ مگر پھر بھی آپ دیکھیں گے کہ کس قدر تازگی۔ جدت اور دلآویزی اصل نظموں کی سی قائم رکھی گئی ہے۔ سرور مہر دراپنی قدرتِ ترجمہ کے لیئے خاص شہرت رکھتے تھے لیکن ان

نظموں میں جو کیفیت ۔ ہم آہنگی اور جدت ہے وہ شاید سرور کے ہاں بھی مشکل ہی سے ملیگی خصوصاً دوسری نظم "نغمۂ فطرت" کے عنوان سے خاص طور پر قابلِ داد ہے :۔

جُنبشِ لب ہے نزاکت سے اگر بار تجھے ۔۔۔ دل میں دیتا ہوں جگہ میں تری خاموشی کو
شوق میں تاروں بھری رات مجسّم بن کر ۔۔۔ ہمہ تن دیدۂ حسرت ہوں ہم آغوشی کو

جلوۂ صبح سے چمکیگا ستارا میرا ۔۔۔ تیرگی رات کی جب نُور سے شرمائے گی
تیری آواز بھی پھر مثلِ شعاعِ خورشید ۔۔۔ سات پردوں سے ضیابن کے نکل آئیگی

ایک ایک حرف ترا سازِ ترنّم بن کر ۔۔۔ غیرتِ نغمۂ مرغانِ خوش الحاں ہوگا
گُل کھلائیگی نئے نغمہ نوازی تیری ۔۔۔ غُنچۂ خاطرِ ناشاد بھی خنداں ہوگا

پوری نظم پڑھئے کہیں بھی الفاظ کی وہ بے ربطی نظر نہ آئیگی جو ترجموں کا خاص نقص ہے ۔ تمام خیالات پورے طور پر ادا ہوئے ہیں اور تمام الفاظ و محاورات اپنی فضاءِ شعری میں معلوم ہوتے ہیں ۔ بندشیں دُرست اور ترکیبیں بالکل چُست ۔ یہی ترجمہ کی معراج ہے ۔

مذہبی نظمیں جناب برق دہلوی ہندو ہیں اور ہندو مذہب کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ تمامتر شعر ہے ۔ بت ۔ بتخانہ ۔ برہمن ۔ کرشن ۔ گوپی ۔ بنسی ۔ رام سیتا ۔ مہابھارت

اور ارجن سب ایک طرف تو جیتی جاگتی باحس ہستیاں معلوم ہوتی ہیں اور دوسری طرف وہ صرف خیالات۔ تصوّرات۔ نقوشِ فطرت اور ہمہ گیر قدرت کے رُموز آشکار و نہاں کے اشارات اور اسرارِ عالم کے آئینہ بردار ہیں اور نام ہیں محض تخئیلی پیرایوں کے۔ مجھے قلق ہے کہ میں اپنے اس خیال کو یہاں اس مختصر سے مقدّمہ میں زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش نہیں کر سکتا۔ صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ جناب برق کی مذہبی نظموں میں اس حُسنِ تخیل کی کماحقہٗ داد دی گئی ہے اور ان کا قلم ہر مقام پر نہایت قابلِ داد طریقہ پر اس امر پر روشنی ڈالنے میں عہدہ بر آ ہوا ہے۔ عصرِ جدید کے انگریزی شعرا نے بھی اس بیحد دلکش اندازِ بیان سے بہت کچھ اثر لیا ہے۔ اور اس موضوع پر چند فطرت نگار جادو رقم شعرا نے بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے۔ مستشرقین سر ولیم جونس نے ابتدا گو سورج۔ اندر دیوتا لکشمی نارائن سرسوتی۔ گنگا کا تذکرہ اپنے خاص پیرایہ میں نظم میں کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ زندۂ جاوید مہابھارت کی مشہور شخصیتوں پر بھی بہت کچھ زورِ طبیعت نظم میں صرف کیا ہے۔ اسی طرح جان لیڈن صاحب جن کی شہرت دنیائے شعر میں جہاں تک مشرقی معاملات کا تعلق ہے کسی طرح سر ولیم جونس سے کم نہیں ہے ایسے ہی موضوع پر قلم اٹھایا ہے اسی سلسلہ میں ہم شیپا ہبر کا نام لیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان مشاہیر کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے چھوٹے شاعروں

نے ہندوستان کی مشہور و معروف نظموں راماین اور مہابھارت کے اور ہندوستانی تاریخ کے چھوٹے چھوٹے معاملات اور اشخاص پر وقتاً فوقتاً نظمیں لکھی ہیں جیسے ہنری ڈروزیو اور کیپٹن ڈیوڈ لسٹر وغیرہ وغیرہ۔

ڈیوڈ لسٹر نے ہندوستانی ستی پر نظم لکھکر اپنے کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

She mounts with dauntless mien, the funeral pile
Where lies her earthly Lord
Or wanders thoughtfully by Ganges shore
While the broad sun upon the slumbering wave
Its last faint flush of golden radiance gave
And tinged with tenderest hue some ruins hoar.

اسی طرح Merideth Parker نے ہندوؤں کے مشہور و معروف قصہ کو کہ کس طرح سمندر کو متھنے سے پہلے پہلے امرت نکلا نظم کیا ہے۔

اس کے بعد اڈون ارنالڈ اور رڈیارڈ کپلنگ کا نمبر ایسے شعرا کی صف میں خاص طور پر ممتاز ہے۔ اڈون ارنالڈ نے جس قدر ہندوستانی قصص اور امور سے دلچسپی کا اظہار اپنی نظموں میں کیا ہے اس کے لیے ہم ہندوستانی جس قدر شکر گزار ہوں کم ہے۔

نل دمینتی کا قصہ جس کو آج سے کئی سو برس پہلے فیضی نے نظم کا جامہ پہنایا تھا اس بے نظیر شاعر اور عالی مرتبت فاضل جیّد کی توجہ مبذول کرائے بغیر نہ رہا ۔ جے دیو کے گیت گووند اور کالی داس کی بلند پایہ نظم رتو سنگھار پر اڈون ارنالڈ کی شاعری دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ بالمیک اور تلسی انگریزی زبان میں لکھ رہے ہیں ۔ اس ذیل میں سر الفرڈ لائل پروفیسر ٹریگو ۔ اڈمنڈ گوس کے نام نامی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے جب مغرب کے شاعروں کے دلوں میں جن کا تعلق ہندوستان سے صرف ضمنی طور پر تھا یا ہے ہندوؤں کی قدیم کتابوں میں اس قدر دلچسپی کے سامان اور موضوعاتِ شعر مجتمع پائے تو کس قدر تعجب کی بات ہوتی ۔ اگر ہندوستان کا ایک سپوت اور ہندو شاعر ہندوستان کے تاریخی اور مذہبی حالات اور واقعات و شخصیات کی جانب اپنی توجہ مبذول نہ کرتا ۔ کس قدر قدرتی بات ہے کہ جناب برق دہلوی کے کلام کے مجموعہ میں ہم ان موضوعات سخن پر نظموں کی اُمید کریں ۔ اس مجموعہ میں کرشن بھگوان ۔ بانسری ۔ سُداماں وغیرہ معرکہ آرا نظموں میں ہماری یہ آرزو پوری ہوتی ہے ۔

ہندو مذہب کی یہ ایک بیحد مشہور بات ہے کہ سری رامچندر جی جو تاجدار اودھ تھے اور قوم کے چھتری تھے انہوں نے ایک بھیلنی کے ہاتھ سے بیر کھائے اور اس کے یہاں ایک خاص مدت تک مہمان رہے ۔ اس قصہ کو لکھ کر خواہ وہ حقیقت ہو یا خیالی بات

یہ نکتہ عوام پر واضح ہو گیا ہے کہ جہاں وہ دل پریم اور محبت سے متصف ہوتے ہیں امتیازات رسمی مثلاً ذات پات کی بندش یا چھوٹے بڑے کی تفریق کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دوسرا نتیجہ جو اس واقعہ سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ جذبِ صادق خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہستی میں کیوں نہ ہو اپنا اثر ایک نہ ایک دن ضرور دکھاتا ہے اور بڑے سے بڑے کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے اسی بات کو جناب برق کس قدر مؤثر اور جذبہ آفریں پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔

بھگوان نے اخلاص و مدارات کو دیکھا　　وارفتۂ دیدار کے جذبات کو دیکھا
کچھ ذات کو دیکھا نہ کچھ اوقات کو دیکھا　　دیکھا تو فقط پریم کی سوغات کو دیکھا

ڈوبے ہوئے تھے بیر محبت کے جو رس میں
خود پریم کے ساگر بھی ہوئے پریم کے بس میں

اسی طرح بن باسیوں کی وطن میں آمد۔ دسہرہ۔ بھرت ملاپ وغیرہ نظمیں ہیں۔ بھرت ملاپ کی نظم میں چند شعر پر بے اختیار واہ واہ منھ سے نکلتی ہے ؎

حیاتِ تازہ ملی سُن کے مژدۂ جاں بخش　　بھرت کی جان میں جان آ گئی جو رام آئے
گلے لگانے کو یوں آئیں تینوں ماتائیں　　کہ جیسے پیاس بُجھانے کو تشنہ کام آئے
نہ نکلی بات بھی پوری برائے پرسشِ حال　　لبوں تک آئے تو کچھ لفظ ناتمام آئے

گورو نانک پر نظم لکھتے ہوئے کیا خوب کہا ہے ؎

جلوۂ حسنِ ازل سے دل ترا معمور تھا زنگِ نقشِ ماسوا اس آئینہ سے دُور تھا
شاہدِ یکتائے عالم کا نظر میں نُور تھا سر بسر کیفِ مئے توحید سے مخمور تھا
چشمِ عرفاں میں تری تجھے کا فزود یندار ایک
جلوہ گر دیر و حرم میں تھا جمالِ یار ایک

فلسفۂ گیتا اور سداماں اور کرشن دولا جواب نظمیں ہیں جن کا مختصر تذکرہ کرکے ان کی خوبی کم نہ کروں گا اہلِ ذوق کو دعوت نظر دیتا ہوں اور بس۔

اس کے بعد اُن نظموں کا نمبر آتا ہے جن کا تعلق دورِ ماضی، تاریخ یا حبِ وطن سے ہے ایسی نظمیں نسبتاً کم ہیں اور افسوس کہ کم ہیں عظمتِ ماضی بڑی چیز ہے۔

قصۂ عظمتِ ماضی کو نہ مہمل سمجھو
قومیں جاگ اُٹھتی ہیں اکثر انہی افسانوں سے"

اس ذیل میں "ہندوستان جنت نشان" "اہلِ ہند" "تیغِ ہندی" وغیرہ وغیرہ نظمیں قابلِ ملاحظہ ہیں جن میں حبِ وطن کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں "مہارانا پرتاب کی تلوار" کے عنوان سے ایک بے نظیر نظم لکھی ہے عموماً قاعدہ ہے کہ جب کوئی تیغ چلانے والا کئی وار کرتا ہے تو کچھ تو ایک وار کرنے کے بعد مجروح کی کیفیتِ جسمانی سے قلب انسانی متاثر ہوتا ہے کچھ خود تلوار چلانے والے کی طاقت ہر وار پر کسی قدر کم ہوجاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلا وار جس قدر

شاندار اور کاری پڑتا ہے آئندہ وار اس قدر اچھے نہیں ہوتے لیکن مہارانا پرتاب کو یہ فخر حاصل تھا کہ اگر سو مرتبہ ایک ہی ساتھ تیغ چلائیں تو پورے سَو وار برابر کاٹ کرتے تھے۔ یہ بات اس نظم میں وضاحت کے ساتھ ایک دلچسپ قصہ کے پیرائے میں بیان کی گئی ہے جس سے واقعہ کی دلکشی میں قابل قدر اضافہ ہو گیا ہے۔

پوری نظم کی روانی اور برجستگی قابلِ داد ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

تھا دامنِ دشت خون سے تر　　لاشیں نظر آئیں تن بے سر
حیرت سے زمیں میں گڑ گئے پاؤں　　سکتہ سا ہوا جکڑ گئے پاؤں
گُم ہوش ہوئے یہ دم زدن میں　　کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

پھرے یہ کھڑے تھے ہر طرف بھیل　　شہ زور سیاہ رُو گراں ڈیل

گُزری ہوئی واردات پُوچھی　　جس کی تھی کھٹک وہ بات پُوچھی

غرضکہ تمام نظم ایسے ہی برجستہ اشعار کا مجموعہ ہے۔

کوئی ہندو ایسا نہیں جس کی آرزو یہ نہ ہو کہ آخر کار جب اِس دُنیائے فانی سے رُوح کو نجاتِ ابدی حاصل ہو تو اس کی مٹی گنگا کی نذر ہو۔

گنگا جی کے عنوان سے جناب برق نے ایک بے عدیل اور آبدار نظم لکھی ہے جس میں رنگینیٔ بیان اور ندرتِ تشبیہات کے علاوہ صحیح اور سچّے ہندو جذبات کی ایک ہندو کی زبان سے ترجمانی کی گئی ہے اور آخر کار اپنی بہترین اور آخری آرزو کا پیش از وقت یوں اظہار فرماتے ہیں:۔

لہروں میں تیری ملکر ہستی ہو پاک میری
اے کاش۔ یوں ٹھکانے لگجائے خاک میری

پانچواں اور اخیر حصہ اُن نظموں کا ہے جنمیں کچھ اصلاحی نقطہ پیش نظر رکھا گیا ہے۔

کوئی انسان ایسا نہیں جسکو صحیح معنوں میں زندہ کہہ سکیں اگر وہ اپنی قوم اور ملک کی بہبود کا دل سے طالب نہ ہو۔ چنانچہ جناب برق کا دل بھی ایسے ہی جذباتِ ترمیم و اصلاح سے مالا مال ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ دور کی ہندو سوسائٹی کی سب سے زیادہ مہلک اور زہریلی دو خرابیاں ہیں۔ اوّل اچھوت ذاتوں کی ہستی اچھوت کی حیثیت سے۔ دوسرے بیوہ کی شادی نہ ہونا۔

حال میں ہندی کی ایک بے مثل اور قابلِ دید کتاب "ابلاؤں کا انصاف" کے نام سے چاند دیپ مالا سے شائع ہوئی ہے جسمیں ہندو بیواؤں کی شادی نہ ہونے کے باعث ہندو دھرم اور سوسائٹی کی جو دلفگار حالت ہے اس کی صحیح اور مکمل تصویر بیحد دلچسپ پیرائے

میں کھینچی گئی ہے۔ اس کتاب کو دیکھکر اپنی سوسائٹی پر کوئی ہند و بغیر درد و غم کے آنسو بہائے نہیں رہ سکتا۔ جناب برق بھی اسی جذبۂ دل آزار سے متاثر ہوئے اور نالۂ بیوہ کے عنوان سے ایک بے نظیر نظم لکھی ہے۔ ہائے کس قدر سچی پُر تاثیر اور کتنی دلکش بات ہے۔

ہجر میں ہوتا ہے تکیہ آرزوئے دید پر
صبر آئے مجھ سیہ قسمت کو کس اُمّید پر

آگے چل کر کس درد انگیز انداز میں لکھتے ہیں:۔

شرم دامنگیر ہے دل بھر کے رو سکتی نہیں　　آنسوؤں سے اپنے دل کے داغ دھو سکتی نہیں
بیکس و بے دست و پا ہوں جان کھو سکتی نہیں　　باعثِ تسکیں کوئی تدبیر ہو سکتی نہیں
صدمۂ دردِ فراق و رنج سہنے کے لئے
میں کہاں سے لاؤں دل ناشاد رہنے کیلئے

یتیموں کی فریاد کی نظم میں ایک درد انگیز شعر ملاحظہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل سے ایک تیر نکلا ہے جو دل کے پار ہوا جاتا ہے ؎

غربت نصیب ہیں ہم خود اپنے ہی وطن میں
جلجائیں شاخ پر جو وہ پھول ہیں چمن میں

جی چاہتا ہے اور دل بے چین ہے کہ اس شعر کی داد دل کھول کر دوں اور اس کے مطالب

معانی اور شعری خوبیاں دکھلاؤں لیکن مقدمہ پہلے ہی سے اس قدر طولانی ہوگیا ہے کہ اب آئندہ کچھ لکھنے کی ہمت نہیں پڑتی مجبوراً اپنی زبان پر مہر لگاتا ہوں اور اپنے رہوارِ قلم کو روکتا ہوں۔

"اچھوتوں سے نفرت فضول ہے" اِس نظم میں جناب برق نے نہایت ہی مُدلل طریقہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کے باشندے اور یہاں کی مٹی سے مخلوق سب ایک سے ہیں اور حد درجہ خود غرضی ہے کہ کوئی ایک فرقہ دوسرے فرقے کو اچھوت خیال کرے۔ واقعی ہندوستان کی کمبختی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہاں خود ایک ہندوستانی دوسرے ہندوستانی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے۔ جب ہم خود اپنے بھائیوں سے ایسا برتاؤ کرتے ہیں تو غیر اقوام کے خلاف ایسی حرکتوں کے لیے کیا کہہ سکتے ہیں اور کس منھ سے کہہ سکتے ہیں۔ جناب برق نے کیا خوب کہا ہے:۔

اِس خاک کے ہیں پُتلے۔ بھارت سپوت ہیں سب
گر یہ اچھوت ہیں تو ہم بھی اچھوت ہیں سب

میں نے دانستہ گنتی کی چند نظموں پر تبصرہ کیا ہے تاکہ ناظرین کی تشنگی ذوق مطالعہ کم نہ ہو جائے

رسم تنقید کے بموجب ضروری تھا کہ میں اس مقدمہ میں جناب برق کے کلام

کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کا بھی ذکر کرتا لیکن شاعر کے عیوب کے متعلق میرے خیالات میں معمولی تخیل کی بہ نسبت ترمیم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر شعر دل پر اثر کرتا ہے اور صحیح معنوں میں شعر کہے جانے کا مستحق ہے تو چند سطحی خامیاں اگر ان میں ہوئیں بھی تو ان کو نظر انداز کرنا چاہیئے۔ اور مجھے یہ بات کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں کہ میں نے نقد و نظر کے اسی اصول کے مطابق جناب برق کے کلام کو مجموعی حیثیت سے

جانچا ہے۔ البتہ میں یہ کہنے کے لیئے تیار رہوں اور بہ نہایت خلوصِ
قلب اور کشادہ پیشانی سے طیار رہوں کہ جناب برق
انسان ہیں اور جب تک انسان انسان ہے
اس سے خطائیں سرزد ہونا لازم
ہے اس لیئے اشعار کے
اِس بیش بہا خزانہ
میں کھرے سکوں کے ساتھ
اگرچند ملت سکّے بھی
نکل آئیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	عنوانِ نظم	نمبر صفحہ
۱	جلوۂ حق	۱
۲	حُسنِ فطرت	۲
۳	ستارۂ صبح	۵
۴	جلوۂ سحر	۶
۵	تاج	۸
۶	مٹی کا چراغ	۹
۷	کرمکِ شب تاب (جگنو)	۱۲
۸	شفق	۱۳
۹	بہارِ شفق	۱۵
۱۰	نسیمِ صبح	۱۷
۱۱	ہجومِ یاس	۲۰

نمبر شمار	عنوانِ نظم	نمبر صفحہ
۱۲	صبحِ اُمّید	۲۲
۱۳	سالِ نو	۲۵
۱۴	کرشمۂ قدرت	۲۶
۱۵	گنگا جی	۲۸
۱۶	بسنت رُت	۳۱
۱۷	آجا	۳۳
۱۸	کرشن بھگوان	۳۵
۱۹	بانسری	۳۷
۲۰	تارے	۳۹
۲۱	تاروں بھری رات	۴۱
۲۲	ماہِ تاباں	۴۳
۲۳	شبِ ماہتاب	۴۴
۲۴	ہندوستان جنّت نشان	۴۶

نمبر شمار	عنوانِ نظم	نمبر صفحہ
۲۵	اہلِ ہند	۴۸
۲۶	تیغِ ہندی	۵۱
۲۷	برطانیہ کا جنگی بیڑا	۵۳
۲۸	پیامِ شوق	۵۵
۲۹	سبزۂ بیگانہ	۵۸
۳۰	شمعِ کُشتہ	۶۱
۳۱	دلِ درد آشنا	۶۴
۳۲	کارِ خیر	۶۷
۳۳	راضی برضا	۷۲
۳۴	ہمہ اوست	۷۳
۳۵	روشنیِ علم	۷۵
۳۶	بہارِ بسنت	۷۶
۳۷	پدمنی کا جوہر	۷۸

نمبر شمار	عنوانِ نظم	نمبر صفحہ
۳۹	زیب النسا کی قبر	۸۱
۴۰	پریم کا تحفہ یا بھیلنی کے بیر	۸۳
۴۱	راجکماری بینّا	۸۵
۴۲	میراں بائی	۸۹
۴۳	قوسِ قزح	۹۳
۴۴	شام	۹۴
۴۵	برسات کی شام	۹۵
۴۶	جلوۂ بسنت	۹۷
۴۷	ٹیسو کے پھول	۹۹
۴۸	ہولی	۱۰۰
۴۹	سرس کے پھول	۱۰۱
۵۰	چمپے کی کلیاں	۱۰۲
۵۱	شکتی بان	۱۰۳

نمبر شمار	عنوانِ نظم	نمبر صفحہ
۵۲	بن باسیوں کی وطن میں آمد	۱۰۶
۵۳	دسہرہ	۱۰۹
۵۴	بھرت ملاپ	۱۱۱
۵۵	دیپ مالا	۱۱۳
۵۶	گرونانک	۱۱۵
۵۷	دورنگی زمانہ	۱۱۷
۵۸	گلِ تر	۱۱۸
۵۹	فضائے بسنت	۱۲۰
۶۰	بچے کی گلابی مسکراہٹ	۱۲۲
۶۱	نوروز	۱۲۵
۶۲	ابرِ کرم برس	۱۲۶
۶۳	عنوانِ بہار	۱۲۷
۶۴	جوشِ بہار	۱۲۸

نمبر شمار	عنوانِ نظم	نمبر صفحہ
۶۵	برسات اور مناظرِ کوہ	۱۳۰
۶۶	عروسِ کوہسار	۱۳۳
۶۷	نیرنگِ ہستی	۱۳۵
۶۸	نالۂ بیوہ	۱۳۸
۶۹	یتیموں کی فریاد	۱۴۰
۷۰	اچھوتوں سے نفرت فضول ہے	۱۴۲
۷۱	فسانۂ بہار	۱۴۴
۷۲	رنگینیٔ بسنت	۱۴۵
۷۳	رضاکار یا والنٹیرز	۱۴۷
۷۴	وان ویر کرن	۱۴۹
۷۵	کرشن سداما	۱۵۳
۷۶	فلسفۂ گیتا	۱۵۸
۷۷	مہارانا پرتاب کی تلوار	۱۶۲

نمبر شمار	عنوانِ نظم	نمبر صفحہ
۷۸	مشاہیرِ نظمِ اردو ص۱۶۷ .. .. دلآویزی پلنت	۱۶۹
۷۹	(انگریزی، ہندی اور فارسی نظموں کے ترجمے) ادائے شکر	۱۷۱
۸۰	نغمۂ فطرت	۱۷۲
۸۱	بوئے خویش	۱۷۳
۸۲	عروسِ مرگ	۱۷۴
۸۳	ساعتِ سفر	۱۷۴
۸۴	حسرتِ نغمہ	۱۷۵
۸۵	روحِ فلسفہ	۱۷۶
۸۶	شہیدِ جفا	۱۷۷
۸۷	نشۂ حسن	۱۸۳
۸۸	مادرِ ناشاد کا خواب	۱۸۵
۸۹	ساعتِ مرگ	۱۸۹
۹۰	فریبِ ادا .. ص۱۹۰ (۹۱) پھول	۱۹۱

دیباچہ

از

جناب منشی اصغر حسین صاحب اصغرؔ گونڈوی (مصنفِ نشاطِ روح)

اُردو کے مشہور ادبی رسائل میں جناب برقؔ دہلوی کی نظمیں اکثر نظر سے گزرتی رہی ہیں۔ اس لئے ان کے شاعرانہ کمال و محاسن کا ایک مجمل نقشہ مدت سے ذہن میں محفوظ چلا آرہا ہے۔ کیا معلوم تھا کہ کسی دن اس پر باقاعدہ اظہارِ خیال کی ضرورت پیش آئیگی اور وہ بھی اس عجلت و غیر مطمئن حالت میں۔

کسی کتاب پر دیباچہ، مقدمہ، یا تبصرے کے نام سے کچھ بندھے ٹکے الفاظ کو چند اوراق میں پھیلا کر شعر و شاعر کی خوش آئند طور پر توضیح کر دینا مشاعروں کی روایتی واہ واہ سے کم نہیں لیکن خیر ہے اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ان بے کیف رسمیات کا کوئی درجہ ہو اور "ہمپایۂ عنصری و خاقانی" یا "رشکِ طالب و کلیم" ایسے فضولیات کے کچھ معنی سمجھے جائیں۔ اب تو وہ شاعر ہو یا نثار اس کے کلام پر نقد و تبصرہ کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے کارناموں کی سائنٹفک تحلیل کر کے یہ بتایا جائے کہ اسکی استعداد و ذہنیت اور اسکے افکار و تخئیل کی ترکیبِ نفسی کیا ہے۔

حالت یہ ہے کہ جناب برقؔ کی نظمیں طبع ہو چکی ہیں بلکہ اس کے اجزا اس وقت میرے سامنے موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عجلت میں اپنی معمولی مصروفیتوں کے ساتھ اسپر ایسی خاطر خواہ بحث جس کا یہ مجموعہ حقیقی طور پر مستحق ہے ممکن نہیں۔ ان بے ربط سطروں اور اس تشنہ و نامکمل بیان کا ذمہ دار ایک دوست کا پاسِ خاطر ہے۔ اسی کے ساتھ میری بے بضاعتی کو بھی شامل

کر لیجیے تو شاید میرے عذرات کی پذیرائی زیادہ آسان ہو جائے۔ بہر صورت جو کچھ عرض ہے اسکی حیثیت ایک سرسری مجمل و مبہم "جنبش لب" سے زیادہ نہیں

طرزِ جدید کی نظمیں

اُردو کی جدید نظمیں آزاد اور مولانا حالی کی مجتہدانہ کاوشوں کی رہین منت کہی جاتی ہیں لیکن یہ بزرگ مغربی علوم و فنون سے ذاتی طور پر باخبر نہ تھے۔ ان کی دُور رس نگاہوں نے صرف مستقبل اور آئندہ امکانات کا ایک خاکہ تیار کیا تھا جس میں اصلی رنگ بھرنے کا شرف اُن لوگوں کو حاصل ہوا جو خود مشرقی و مغربی شعر و ادب کے ماہر تھے چنانچہ یہ کام مختلف عنوانوں سے انجام دیا گیا کہیں تو کھلا کھلا ترجمہ تھا، کہیں مغربی خاکے میں مشرقی رنگ اور کبھی مغربی رنگ کو مشرقی خاکے میں بھرنے کی کوشش کی گئی۔

صاف صاف ترجمے کی مثالیں نادر کاکوروی کے مجموعۂ نظم میں بکثرت مل سکتی ہیں۔ مثلاً ٹامس مُور کی نظم Oft in the stilly night کا ترجمہ "اکثر شب تنہائی میں" اور Curfew will not ring tonight کا ترجمہ "گھنٹہ نہیں بجے گا" کے عنوان سے کیا گیا۔ اسی طرح ٹامس مُور کی نظم The last rose of Summer کا ترجمہ سرور جہان آبادی نے "موسم گرما کا آخری گلاب" اور مولوی ظفر علی خاں نے ٹینیسن کے The Brook کا ترجمہ "ندی" کے عنوان سے کیا۔ مولوی طبا طبائی کی نظم "شام غریباں" گرے کے Elegy written in a country churchyard کا کھلا ہوا ترجمہ ہے شیکسپیر کے "Mercy" کا ترجمہ منشی تلوک چند محروم نے "رحم" اور بائرن کے "The Ocean" کا ترجمہ مولوی وحید الدین سلیم نے "سمندر" کے عنوان سے کیا۔ اس طرح اُردو نظم کا دامن طرح طرح کے گل بوٹوں سے مزین ہونے لگا۔ اکبر و اقبال

کے یہاں اگرچہ صاف صاف ترجمے کی مثالیں بہت کم دستیاب ہوسکتی ہیں لیکن اُردو نظم کو مغربی تخیل اور مغربی اندازِ بیاں سے مالا مال بنانے کی سعی بیک نظر معلوم ہوسکتی ہے۔ اکبر مرحوم کی نظم آبِ لڈور ساؤدی کی نظم کا چربہ ہے۔ اقبال کا مصرع ۔ع جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور۔ گرے کے "The path of glory leads but to the grave" اور ع تو بھی رو اے خاکِ دلی داغ کو روتا ہوں میں ۔ شیلی کے Wake melonchaly mother wake and weep کا بدلا ہوا قالب ہے۔ اسی طرح پھر نوحۂ داغ میں لکھتے ہیں ؎ اقبال

بلبلِ دلی نے باندھا اُس چمن میں آشیاں ہمنوا ہیں سب عنادل باغِ ہستی کے جہاں

یہ شیلے کے For he is gone where all things wise and fair descend کا ایک خوبصورت پرتوۂ خیال ہے۔

یہی وہ مساعیِ جمیلہ ہیں جنسے اُردو نظموں کے قدیم و فرسودہ قالب میں ایک تازہ جان پیدا ہوئی اور شاعری کا دامن تنوعات کے اعتبار سے وسیع تر ہونے لگا لیکن بعض قدیم خیال کے بزرگ جنکے دماغوں میں پہلے چنبیلی کی خوشبو بسی ہوئی ہے اور وہ انگلش ورڈز اور لونڈر کے نام ہی سے جس طرح چیں بجبیں ہوجاتے ہیں اُسی طرح یہ جدید قسم کی نظمیں بھی فرسودہ مذاق شعراء کے حلقوں میں ناپسند کی گئیں خیر ایسے لوگوں کا تو ذکر ہی فضول ہے جنکے نزدیک رشک و ناسخ کا مصیبت انگیز کلام اُردو شاعری پر آخری لفظ ہے ہمارے نہایت سنجیدہ اور خوش مذاق طبقے کو بھی یہ اندیشہ ہو چلا کہ شعر و ادب پر بھی اگر مغرب کا ایسا ہی غلبہ و تسلط رہا تو کسی دن مشرق کی تمام خصوصیات یکسر کالعدم و نسیاً منسیا ہو جائینگی، اس میں شک نہیں کہ یہ مسئلہ ایک سنجیدہ غور و بحث کا محتاج ہے۔ ایک طرف فطرت کا یہ زبردست قانون ہے کہ ہر شعبۂ حیات میں تمدن و ترقی یافتہ اقوام کے آثار و پرتو کو قبول کیا جائے انتہا یہ کہ جب ہم مغرب کی مخالفت میں بھی آواز

بلند کرتے ہیں تو ہمارے عتاب و بیزاری خفگی کی لے بھی مغرب ہی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نکلتی ہے۔ دوسری طرف جس طرح یہ امر ناگزیر ہے اسی طرح کپلنگ کا یہ مقولہ بھی مقتضائے فطرت ہے کہ "مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق اور دونوں کے سر رشتے باہم نہیں ملسکتے" ان متضاد حالات کا قدرتی تقاضہ یہ ہے کہ مشرق مغرب کا مزاج آشنا ہو کر اپنی خصوصیات کو قائم رکھے تعلق و ہمرنگی کے معنی ایک دوسرے میں محو و مدغم ہونے کے نہیں ہیں بلکہ اسکا مفہوم فراخ دلی و رواداری ہے۔ تہذیب و تمدن کیطرح شعر و ادب بھی اس کُلیے سے مستثنیٰ نہیں مشرقی و مغربی شعر و ادب کی مخالطت باہمی کا مطلب بھی وسعت مذاق تازگی خیال، اور شان ہمہ گیری ہے جسکی ابتدا اگرچہ تمامتر ترجمے اور اخذ و اقتباس کی رہین منت ہوتی ہے لیکن اس عمل کا یہ ارتقائی نتیجہ ہے کہ ملکی و قومی خصوصیات کیساتھ شعر و ادب میں بھی نئی نئی کیفیت رُونما ہو جائیں۔

انسانی دماغ کو خواہ نفسیاتی حیثیت سے تحلیل کیجیے یا نفس خیال کی تشریح و تنقید نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے جناب برق کی تصویر کے نیچے یہ شعر درج ہے؎

کھل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی　　　میں چمن زار جہاں میں گُل صحرائی تھا

اس شعر میں بظاہر کوئی ایسی بات نہیں نظر آتی جو مشرقی ہو اور جو ہمارے یہاں کے شعرا کی دسترس سے باہر ہو پھر بھی اسکی دلآویزی و جدت نہایت حیرت انگیز ہے۔ مگر اب گرے کے Full many a flower is born to blush unseen, And waste its sweetness in the desert air. کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ معلوم ہوگا کہ جناب برق کا دماغ اس سے ناآشنائے محض نہیں ہے مگر انکا شعر اسکی پوری پوری آواز بازگشت بھی نہیں جسطرح آفتاب کی ہلکی اور تیز شعاعیں باغ و چمن کو طرح طرح سے رنگین کرتی رہتی ہیں اُسی طرح وسعت مذاق شاعر کے دماغی تخیل کو نیم شعوری حالت میں

گوناگوں کیفیتوں سے لبریز کرتی رہتی ہے۔ مغربی تخیل کا انعکاس مذکورہ شعر پر اس درجہ ہلکا اور لطیف ہے کہ تبصرہ نگار تو ایک طرف شاید خود شاعر کو اس کا احساس دشوار ہو گیا ہو۔

جناب برق کی نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ جس طرح انکے عنوانات بظاہر مشرقی اور ہندوستانی نظر آتے ہیں اسیطرح انکی روح بھی خالصاً مشرقی و ہندوستانی ہے۔ مغربی شعر و ادب کی واقفیت سے صرف اس میں وسعت مذاق کا اضافہ ہوا ہے یہ نہیں کہ انکی اصلیت و ماہیت تبدیل ہو کر مغربیت کی بسیط فضا میں گم ہو گئی ہو اور شاید یہی وہ کامیابی ہے جو کسی بڑے سے بڑے جدید تعلیم یافتہ شاعر کو نصیب ہو سکتی ہے۔

نیچرل اور تخلیقی شاعری

جدید نظموں کی وہ ایک امتیازی خصوصیت جو مغرب سے مستعار لی گئی ہے وہ مناظر قدرت کی مصوری ہے اسے عام طور پر نیچرل شاعری اور زیادہ شائستہ لوگ منظریہ شاعری کہنے لگے۔ اس میں مناظر و مظاہر کی ہیئت و صورت کی عکاسی و مصوری ضرور کی گئی لیکن اکثر اسکی اصلی روح سے بے پروائی و غفلت برتی گئی۔ حالانکہ شاعر صرف مصور اور تصویر کش نہیں ہے بلکہ وہ صورت گر اور خالق بھی ہے۔ اسکے یہاں بظاہر تصویریں نظر آتی ہیں مگر وہ تصویریں نہیں ہیں بلکہ اسکی جاندار مخلوق ہیں وہ جسد و پیکر کا بیجان مجسمہ نہیں بلکہ وہ زندہ ہستیاں ہیں جو الفاظ و بیان کے لباس میں صدہا اعیان و مظاہر اور ہزارہا صورت و معنی کے نقشے ذہن کے سامنے پیش کرتی رہتی ہیں۔

جناب برق کی وہ نظمیں جنمیں مناظر کے یہ نقشے پیش کیے گئے ہیں وہ "حسن فطرت"۔ "جوش بہار" "جلوۂ بسنت"۔ "نسیم صبح"۔ اور "مٹی کا چراغ" وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان نظموں کو غائر نظر سے دیکھیے تو "نیچرل شاعری" اور "تخلیقی شاعری" کا یہ نازک اور باریک فرق صاف صاف نمایاں ہو جائیگا مثلاً "حسن فطرت" کے عنوان سے جو نظم ہے اس میں ذیل کے مصرعوں پر نظر فرمائیے:۔

ع:۔ ہے چادر مہتاب کہ اک نور کا سیلاب

ع :۔ معمورِ لطافت سے ہے دنیائے نباتات

ع :۔ ہر پیکرِ تصویر میں ہیں حسن کے ذرّات

ع :۔ دامانِ فضا حسن کے جلووں سے ہے معمور

ان مصرعوں میں صرف مناظر کی شکل ہی نہیں بلکہ ان کی رُوح بھی موجود ہے۔ اس میں صرف مظاہر و مناظر کے چھاپے پر گُل بوٹے نہیں بنا دیے گئے ہیں بلکہ صحیح آرٹسٹ کی طرح ایک زندہ اور جاندار ہستی تیار کر کے تخلیقی شان کی بھی نمائش کی گئی ہے۔

جنابِ برؔق کی ان نظموں میں فنی (آرٹسٹک) حیثیت سے آثارِ زندگی اور لطافتِ خیال کے علاوہ ایک بلند حکیمانہ نظر کی جھلک بھی صاف صاف نمایاں ہے۔ مثلاً :۔ سہ

جو شعلۂ بیتاب میں سامانِ تپش ہے
روئے گلِ خنداں میں وہی جذب و کشش ہے

لیکن صحیح شاعری کے زاویۂ نگاہ سے حکمت و فلسفہ کے کتنے ہی گہرے اور غامض مسائل کیوں نہ ہوں جب تک ان میں درد و نیاز، سوز و تپش کی برقی حرارت بھی کارفرما نہ ہو اس کی حیثیت ایک جسدِ بے روح سے زیادہ نہیں۔

مشرق کی عظیم الشان روایات اس کی شاہد ہیں کہ اُس نے ہوائی جہازوں کی تشکیل کے مقابلہ میں انسانیت کی تکمیل و تہذیب پر زیادہ زور دیا جوش و خروش تپش و نیاز صرف شعر و ادب ہی کی جان نہیں۔ بلکہ خود انسانیت کی جان اور اُس کا اصلی غازۂ جمال ہیں۔ مشرق نے اسکی حصولیابی

کے لیے اعلیٰ اور مقدس ہستیوں کو آئیڈیل قرار دیا اور انسانی روح کو اسی آئیڈیل کی جانب گرمِ عناں کرکے اُسے جوشِ تپش سے لبریز کردیا۔ اسی جوش تپش کا نام اس کی زبان میں "مذہبیت" ہے۔

جناب برق کی نظم "بن باسیوں کی وطن میں آمد" اگرچہ بظاہر واقعہ نگاری و منظریہ شاعری کا نمونہ ہے، مگر اس کے پردے میں اسی درد و نیاز کی ہلکی ہلکی کیفیت کام کررہی ہے۔

"میراں بائی" کی نظم میں یہ کیفیت اور زیادہ متلاطم ہوکر سوز و درد، جوش و خروش، بھگتی اور نیازمندی کا آتش کدہ بن گئی ہے۔

مختصر یہ کہ جناب برق کی شاعری اُس طرح کے حریفانہ اور بازاری جذبے کا نتیجہ نہیں ہے جس سے بعض حلقوں میں زبان و محاورے کی کچھ بحثیں اور فن و اُستادانہ فن کی بلند آہنگیوں کے ساتھ ایک مردہ و بے کار سرمایۂ پندار و تبختر تیار ہوگیا ہے اور جو ہماری شاعری کے لیے یکسر ادبار و مصیبت کی چیز ہے، بلکہ ان کی فطرت کی رسائی حقیقی شعریت کی اُس فضائے لطیف تک معلوم ہوتی ہے جو کیف و سرور اور جوشش و انبساط کی معنوی لذتوں سے معمور و لبریز ہے۔

"یادش بخیر" دلّی نے اپنے عہدِ ماضی میں کیا کیا بلند مرتبت ہستیاں تیار کی تھیں۔ آج ایک مدّت کے بعد اس کی خاک سے پھر ایک شرارہ بلند ہوکر ستارے کی طرح اُفقِ شاعری پر نمودار ہوا ہے۔ امید ہے

کہ اربابِ ذوق اس کا کافی و مناسب جوش و خروش سے خیر مقدم کریں گے ؎

کسے کہ محرمِ بادِ صباست می داند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقیست

اصغر (مصنفِ نشاطِ روح)
الہ آباد - ۲۷ مئی ۱۹۲۹ء





مہاراج بہادر برقؔ دہلوی۔ بی۔ اے

کھل کے مُرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی
میں چمن زارِ جہاں میں گُلِ صحرائی تھا

جلوۂ حق

شیرازہ بندِ دفترِ امکاں ہے شانِ حق   سرچشمۂ حیات ہے فیضِ روانِ حق
بارانِ لطف ہے کرمِ جاودانِ حق   ذرّے زبانِ حال سے ہیں تر زبانِ حق

رنگِ نوائے راز ہے ہستی کے ساز میں
در پردہ بس رہی ہے حقیقت مجاز میں

تابش فزائے ماہِ نظرتاب ہے وہی   ضوبخشِ برقِ غیرتِ سیماب ہے وہی
نزہت دہِ رخِ گلِ شاداب ہے وہی   زینت فروزِ عالمِ اسباب ہے وہی

حق کی ضیا سے نور کا مطلع جہان ہے
ذرّوں میں آفتابِ درخشاں کی شان ہے

روئے مجاز عکس ہے حق کی صفات کا   پرتو اس آئینہ میں ہے انوارِ ذات کا
حق اصلِ کل ہے سلسلۂ کائنات کا   اعجازِ حق ہے رازِ طلسمِ حیات کا

ظلمت سرائے دہر میں ہے حق کی روشنی
جلوہ فشاں ہے قادرِ مطلق کی روشنی

زیبِ ریاضِ دہر اگر فیضِ حق نہ ہو　　رنگیں کتابِ خندۂ گل کا ورق نہ ہو
نیرنگِ دلفریب بہارِ شفق نہ ہو　　مہرِ مبیں سے چرخ کا روشن طبق نہ ہو

ایوانِ شش جہت میں برستا جو نور ہے
حق تو یہ ہے یہ جلوۂ حق کا ظہور ہے

منظومہ اگست ۱۹۱۸ء

حسنِ فطرت

اک جلوہ گہِ حسن ہے یہ عالمِ اسباب　　نظارہ بداماں ہے رخِ مہرِ جہانتاب
ہے چادرِ مہتاب کہ اک نور کا سیلاب　　ہر اخترِ تابندہ ہے رشکِ دُرِ نایاب

ہے وسعتِ دامانِ خلا حسن سے لبریز
آنکھیں ہوں تو ہیں ارض و سما حسن سے لبریز

جھرمٹ میں ستاروں کے ہے کیا شانِ جمالی　　کس درجہ ہے دلکش شفقِ شام کی لالی
کانٹے ہوں کہ پھولوں میں تلتی ہوئی ڈالی　　دنیا میں کوئی چیز نہیں حسن سے خالی

بیتابیِ امواج میں بھی حُسن نہاں ہے
یہ جُنبشِ پیہم کا سماں اور کہاں ہے

معمورِ لطافت سے ہے دنیائے نباتات — ہر گُل میں نئی بُو ہے نیا رنگ نئی بات
ہر پیکرِ تصویر میں ہیں حُسن کے ذرّات — نیرنگیِ جلوہ ہے اسی شے کی کرامات

ہر نقشِ دل آویز ہے نُدرت کا مرقّع
اعجازِ قلمکاریِ قدرت کا مرقّع

کہسارِ فلک رس ہے کہیں پھیلے بیاباں — دریائے رواں ہے کہیں فضائے چمنستاں
فیّاضیِ فطرت سے ہے نظّارہ بداماں — بہرِ نگہِ شوق ہے صد جلوہ ارزاں

پھیلا ہوا ہر سمت ہے اِک دامِ تماشا
حیف اُن پہ جو آنکھیں ہیں ناکامِ تماشا

دامانِ فضا حُسن کے جلووں سے ہے معمور — یہ برقِ صفت ہیں کہیں ظاہر کہیں مستور
ہو ذوقِ تماشا جسے ہرگز نہیں معذور — جس سمت پڑے آنکھ نظر ہوتی ہے مسرور

ہیں دفترِ ہستی کے ورق دید کے قابل
جو ذرّہ ہے ۔ ہے منزلِ خورشید کے قابل

ہر ذرّے کے دامن میں ہے اک حُسن کی دُنیا — ہر قطرے میں ہے قلزمِ ذخّار کا نقشا

ہر دانے سے خرمن کے ہیں آثار ہویدا ہر شعلے میں ہے برقِ سرِ طور کا جلوا
ہر جزو کے آئینے میں عکسِ رخِ کُل ہے
ہے اپنی جگہ ایک چمن زار جو گُل ہے

جو منظرِ دلچسپ ہے فردوسِ نظر ہے نیرنگِ شبِ تار ہے یا نورِ سحر ہے
ہے غنچۂ وابستہ کہ شبنم کا گہر ہے ہر شے میں نیا حسن، نیا رنگِ اثر ہے
جو شعلۂ بیتاب ہیں سامانِ تپش ہے
روئے گلِ خنداں میں وہی جذبِ کشش ہے

دل میں ہو اگر آرزوئے حسن پرستی ہے عالمِ تصویر، صنمخانۂ ہستی
ہے فرش سے تا عرش یہاں اوج کہ پستی انوار سے معمور ہے یہ حسن کی بستی
جو ذرّہ ہے وہ خاتمِ قدرت کا نگیں ہے
جو شکل ہے اس آئینہ خانے میں حسیں ہے

کیا باصرہ افروز ہیں یہ نور کے جلوے ہیں جنّتِ نظّارہ، یہ ضوپاش نظارے
وا دیدۂ دل ہو جو کوئی غور سے دیکھے اے برق یہ سب حسنِ ازل کے ہیں کرشمے
گنجینۂ اسرار ہے معمورۂ ہستی
اک مطلعِ انوار ہے معمورۂ ہستی

منظومہ اکتوبر ۱۹۲۸ء

ستارۂ صبح

ضیا فروشِ سرِ چرخ ہے ستارۂ صبح نشانِ محفلِ انجم ہے ماہ پارۂ صبح
اسے نصیب کہاں فرصتِ نظارۂ صبح فسردہ ہونے کو چمکا ہے یہ شرارۂ صبح

ملی ہے ہستیِ بے بود نیست ہونے کو
کہ آنکھ کھولی ہے خوابِ عدم میں سونے کو

شبِ گزشتہ کے جلووں پہ اشکباری یہ اداس صورتِ شمعِ سرِ مزار ہے یہ
خزاں نصیب کوئی غنچۂ بہار ہے یہ نظر کو پیرہنِ نور میں بھی خار ہے یہ

چراغِ کشتہ ہے بامِ سپہرِ اخضر پہ
یہ داغ ہے فلکِ نیلگوں کی چادر پہ

نمودِ صبح سے گُل ہو گئے چراغِ نجوم نسیمِ سرد کا جھونکا تھا موجِ بادِ سموم
طلسمِ زینتِ لیلائے شب ہوا معدوم عیاں شفق سے ہے نیرنگِ دہر کا مفہوم

اس انقلاب کی ہے یادگار اخترِ صبح
برنگِ اشک ہے بے آب و تابِ گوہرِ صبح

تپِ الم سے ہے فق رنگِ روئے رنجیدہ ہے مانندِ صورتِ یاقوتِ ناتراشیدہ

سحر کے جلوے ہیں مشرق میں نیم خوابیدہ — یہ ڈالتا ہے انہی پر نگاہ دزدیدہ
پیام نور کے تڑکے سحر کا لایا ہے
نوید مقدم خورشید دینے آیا ہے

منظومہ اپریل ۱۹۲۵ء

جلوۂ سحر

نکلا وہ آفتاب شبستان شرق سے — پھیلی ضیائے صبح درخشاں قریب و دور
بلّوریں بادلوں کے ہیں کیا زرق برق سے — افلاک سے زمیں پہ برستا ہے ایک نور

تاروں کی اب کہاں ہیں وہ جلوہ نمائیاں — گل ہیں چراغ مہر منوّر کے سامنے
چھٹتی ہیں ماہتاب کے رخ پر ہوائیاں — کیا رنگ جم سکے شہ خاور کے سامنے

زرتار ہو گئی ہیں پہاڑوں کی چوٹیاں — سیماب پیرہن ہے ہر اک موج آبشار
پانی میں کوندتی ہیں شعاعوں سے بجلیاں — خیمے حباب کے ہیں لب آب زرنگار

ہیں نغمہ زن طیورِ سحر خیز باغ میں
محوِ سپاسِ حق ہیں طاعت گزارِ صبح
شبنم کی ہے شرابِ گُلوں کے ایاغ میں
کتنی سرور خیز ہے سیرِ بہارِ صبح

انگڑائی لیکے سبزۂ خوابیدہ جاگ اُٹھا
اُترا خمار نرگسِ بدمستِ خواب کا
سورج مکھی کا اخترِ قسمت چمک گیا
کھولی ہے آنکھ دیکھ کے مُنھ آفتاب کا

کیا تازگی ہے خندۂ گُل کی شمیم میں
فرحت فزا ہے قلب ہے تازہ کُن دماغ
اعجازِ جانفزائی ہے موجِ نسیم میں
وقتِ سحر بجھے ہوئے دل بھی ہیں باغ باغ

مصروفِ کاروبارِ جہاں ہے ہر اک بشر
ہو کر شرابِ خوابِ شبانہ سے تازہ جاں
منزل سے قافلے بھی ہیں گرمِ رہِ سفر
پرچمِ شعاعِ مہر کا ہے کوچ کا نشاں

بیٹھا جہاں پہ سکۂ خورشیدِ خاوری
زیرِ نگینِ مہر ہے اورنگِ کائنات
ظاہر ہیں ذرّے ذرّے سے آثارِ زندگی
چاروں طرف ہے گرمیِ ہنگامۂ حیات

منظومہ مارچ سنہ ۱۹۲۲ء

تاج

بساطِ خاک پہ تُو ہے نگار خانۂ حُسن　　رقم ہے یا سرِ لوحِ زمیں فسانۂ حُسن
جبینِ سنگ پہ منقوش ہے ترانۂ حُسن　　نظر نواز ہے یا گوہرِ یگانۂ حُسن
خجل ہے جلوۂ مہتاب، وہ ضَو تجھ میں
نہاں ہے شانِ ادائے عروسِ نَو تجھ میں

ز فرق تا بقدم پیکرِ حسیں ہے تو　　ردائے نور میں ملبوس نازنیں ہے تو
مُرقّعِ کششِ حُسنِ دل نشیں ہے تو　　بہارِ خُلد کی تصویر بالیقیں ہے تو
فروغِ دیدۂ دل جنّتِ نظارہ ہے
ضیا فشاں کُرۂ ارض پہ ستارہ ہے

شگفتہ تختۂ نسریں ہے تو، کہ قصرِ بلور　　سپیدۂ سحری ہے کہ خرمنِ کافور
نظارہ کفِ سیلاب ہے، کہ چشمۂ نور　　فرازِ خاک پہ یا ضَو فگن ہے شعلۂ طُور
نثارِ جلوۂ سیمیں ہے چشمِ نظّارہ
فدائے شوکتِ تزئیں ہے چشمِ نظّارہ

عجائباتِ زمانہ میں انتخاب ہے تو　　زمیں پہ منزلِ خورشید کا جواب ہے تو

سپہرِ حسن ہے، یا برجِ ماہتاب ہے تو ۔ نگار خانۂ صنعت کنارِ آب ہے تو

یہ تیرا عکس ہے سیلاب کی روانی میں

کہ اک سفینۂ زرّیں پڑا ہے پانی میں

نہاں ہے گوہرِ نایاب تیرے دامن میں ۔ خموش شمعِ فروزاں ہے گنجِ مدفن میں

بہارِ حسن ہے خوابیدہ صحنِ گلشن میں ۔ سکوں پذیر ہے ممتاز اپنے مسکن میں

حریمِ خاک میں ہیں حسن و عشق ہم آغوش

ہیں محوِ خواب عدم تاج و تاجدار خموش

منظومہ فروری سنہ ۱۹۲۷ء

مٹی کا چراغ

ہلکا ہلکا نور برساتا ہے مٹی کا چراغ ۔ اس کی ضو پاشی سے مٹ جاتا ہے ظلمت کا سراغ

وہ چمک ہے اس میں تارے چرخ پر کھاتے ہیں داغ ۔ بادۂ نابِ تجلّی کا ہے چھوٹا سا ایاغ

لیلیٰ شب کا شرارِ حسن بے پردہ ہے یہ

رو کشِ مہرِ ضیا پرور ہے وہ ذرّہ ہے یہ

کیا سرور انگیز اسکا جلوۂ مستانہ ہے ۔ بیخودِ صہبائے آتش خیز ہر پروانہ ہے

سُرخیِ افسانۂ شبِ زینت کاشانہ ہے　　میں سیہ قسمت ہوں یہ میرا چراغ خانہ ہے

شامِ غم اسکے فروغِ رُخ سے نورانی ہوئی
تیرگی میں نور پھیلا جلوہ سامانی ہوئی

اس کے شب افروز جلوے سے فضا معمور ہے　　دیدۂ نظارہ جو روشن ہے دلِ مسرور ہے
شعلۂ عریاں میں پنہاں رنگِ برقِ طور ہے　　شمع کافوری بھی اسکے سامنے بے نور ہے

دیکھنا اک پارۂ گِل کی ذرا اوقات کو
نور کے سانچے میں ڈھالا ہے اسی نے رات کو

ماہِ نو اس سے خجل ہے یہ نمایاں ہو گیا　　نیم رُخ اپنا دکھاتے ہیں جو پنہاں ہو گیا
بخت چمکا رات کا جب یہ فروزاں ہو گیا　　گرمیِ ہنگامۂ محفل کا ساماں ہو گیا

ہے سراپا حُسن کا شعلہ پتنگوں کیلئے
موہنی مورت ہے یہ اُنکی اُمنگوں کیلئے

روئے آتشناک سے شعلہ مزاجی ہے عیاں　　جنبشِ بادِ صبا بھی ہے نزاکت پہ گراں
کیوں نہ رکھیں اس کو ہاتھوں چھاؤں محبت سے نغمۂ جاں　　سُرمۂ چشمِ حسیناں اسکی لَو کا ہے دھواں

طفلکِ نوخیز کی اس سے نظر مانوس ہے
اسکا جلوہ بے نیازِ پردۂ فانوس ہے

رات بھر سوزِ دروں رکھتی ہے گرمِ سوز و ساز خرمنِ جاں پھونکتی ہے برقِ عشقِ دل گداز
اس کی خاموشی ہے اک روشن مثالِ ضبطِ راز تابِ گویائی ہے کم، افسانۂ الفت دراز

کتنی زحمت ہے حیاتِ مختصر کے واسطے
گُل بداماں ہے یہ خورشیدِ سحر کے واسطے

یہ وہ شے ہے روشنی کا بول بالا اس سے ہے گرمیٔ بزمِ طرب گھر گھر اُجالا اس سے ہے
لکشمی پوجا کی زینت، دیپ مالا اس سے ہے مُنھ شبِ تاریک کا دنیا میں کالا اس سے ہے

جھونپڑی مفلس کی روشن ہے اسی کے نور سے
یہ مسافر کو دکھا دیتا ہے منزل دُور سے

سچ ہے گر مہرِ منوّر کا اسے خاکا کہوں روزِ روشن کا مُرقع آتشیں جلوا کہوں
عکسِ برقِ طور، تصویرِ یدِ بیضا کہوں شعلہ زارِ حُسن کا سرتا بہ پا نقشا کہوں

برق شاید مہرۂ مارِ سیاہِ شب یہ ہے
یا زمیں پر چرخ سے ٹوٹا ہوا کوکب یہ ہے

منظومہ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء

کرمکِ شب تاب (جگنو)

پرتوِ نور ہے یا شمعِ شب افروز ہے تو / آتشِ حسن کا یا پارۂ دلسوز ہے تو
یا ہے غلطیدہ ہوا میں دُرِ شبنم کوئی / شررِ آتشِ گُل یا ہے مجسم کوئی
خندۂ جامِ بلوریں ہے ہوا میں پرّاں / گرمِ پرواز ہے یا پرتوِ شاخِ مرجاں
محوِ پرواز یہ لعلِ یمنی ہے شاید / اُڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہے شاید
شمعِ رخسارِ گُلِ تر کا جو دیوانہ ہے / پیرہن نور کا پہنے ہوئے پروانہ ہے
آتشِ حُسن کی اُڑتی ہوئی چنگاری ہے / شبِ تاریک میں جو محوِ ضیا باری ہے
چشمکِ برق کا یہ نقشِ تبسم تو نہیں؟ / غنچۂ نیم شگفتہ کا تبسم تو نہیں؟
برقِ رخسار کا یا جلوۂ بیتاب کہوں / اس کو اُڑتا ہوا اِک قطرۂ سیماب کہوں
کسی ناشاد کی آہوں کا شرارا تو نہیں؟ / آسماں سے کوئی ٹوٹا ہوا تارا تو نہیں؟
تجھ میں اے کرمکِ شب تاب چھلک نور کی ہے / چشمکِ برق سے نسبت ہے مگر دور کی ہے
لیلیِ شب کا چراغِ تہہِ دامن ہے تو / یا کہ چھوٹی سی کوئی مشعلِ روشن ہے تو
شوخیوں میں ہیں تری برقِ نظر کے انداز / تیری پرواز میں ہیں رقصِ شرر کے انداز
کمسنوں کیلئے معشوقِ دل آرا ہے تو / دیدہ بازوں کیلئے آنکھ کا تارا ہے تو

برقِ ایمن کو جو منظور ہوئی اپنی نمود ڈھل گیا نور کے سانچے میں ترا نقشِ وجود
حسن میں تیرے عجب نازِ دل آرائی ہے تیرا جلوہ کبھی پنہاں کبھی پیدائی ہے
تیری تنویر میں ہے فاسفرس کا جلوہ جس کے آگے ہے خجل شعلۂ خس کا جلوہ
جلوۂ حسن ترا پردے سے مانوس نہیں تو ہے وہ شمع کہ شرمندۂ فانوس نہیں
شبِ تاریک میں صد مایۂ تابش بن کر محو پرواز ہے پرکالۂ آتش بن کر
میہماں صحنِ گلستاں میں ہے تو رات کی رات مایۂ عیش ہے تیرے لیے برسات کی رات
تیری پرواز نے کھینچی وہ طلائی جدول جس سے زرتار ہوا لیلیٔ شب کا آنچل
تیرے جلوے سے منور ہوا صحنِ گلشن تو ہے وہ شمع کہ ہے موجِ ہوا پر روشن

تابش افزائے نظر تیری شرر باری ہے
پھر چمک! برق کے لب پہ یہ سخن جاری ہے

(جون ۱۹۱۸ء)

شفق

دید کے قابل ہے رنگِ ارغوانِ شفق دل ربا ہے سرخیِ دامانِ زرتارِ شفق

آسماں پہ ہو جزن جیسے شرابِ سرخ ہے
یا محیطِ چرخِ زنگاری سحابِ سرخ ہے

نقش بستہ آفتابِ شام کی تنویر ہے
جلوۂ آخر کی اک مٹتی ہوئی تصویر ہے

آئینے میں چرخ کے ہے عکسِ تصویرِ بہار
تابش افزائے نظر ہے یا فروغِ شعلہ زار

روئے زیبائے عروسِ شام کا پرتو ہے یہ
گوشۂ مغرب منور جس سے ہے وہ ضو ہے یہ

از سرِ نو پھوٹ نکلا ہے شبابِ چرخِ پیر
یا مئے احمر ہے زیبِ شیشۂ ابرِ مطیر

رنگ لایا ہے شفق بنکر شہیدوں کا لہو
لوحِ گردوں سے عیاں ہیں نقشِ خونِ آرزو

جلوۂ زریں فضا میں جاذبِ نظارہ ہے
منظرِ رنگیں نگاہِ شوق کا گہوارہ ہے

قصرِ فردوسِ بریں کا دلنشیں نقشہ ہے یہ
یا بہارِ بوستانِ خُلد کا خاکہ ہے یہ

سُرخ جوڑا لیلیِ شب نے کیا ہے زیبِ تن
روزِ روشن سے ہے ہم آغوش چوتھی کی دلہن

دیکھ لے چشمِ تماشا جو یہ جلوہ دیکھ لے
کلکِ صنّاعِ حقیقی کا کرشمہ دیکھ لے

اے شفق اے نقشِ دل آویزیِ رنگِ حسن
اے طلسمِ رنگ اے آئینۂ نیرنگِ حسن

پرتوِ مہرِ مبیں کا رازِ سربستہ ہے تو
یا سرِ طاقِ فلک رنگین گلدستہ ہے تو

برق کی چشمک تری رنگیں ادائی پر نثار
کہکشاں کا نور اس جلوہ نمائی پر نثار

مایۂ تسکیں ہے تو ذوقِ نظر کے واسطے
دامنِ گلچیں ہے تو ذوقِ نظر کے واسطے

چرخ کے اسٹیج پر اک پردۂ رنگیں ہے تو
زینتِ دوشِ فلک یا چادرِ زریں ہے تو

کیف آور تیرا جلوہ ہے سکوتِ شام میں
آتشِ سیّال ہے لبریز تیرے جام میں

بادۂ گلرنگ کا تیرے مزا لیتا ہوں میں
تشنگیِ ذوقِ نظّارہ بجھا لیتا ہوں میں

تیری رنگینی سے عقدہ کھل گیا یہ اے شفق
دفترِ ہفت آسماں کا تو سنہری ہے ورق

جو دکھاتے ہی جھلک اُڑ جائے وہ سیماب ہے
بے ثباتی کا مُرقع جلوۂ بیتاب ہے

محو ہو جاتے ہیں دم بھر میں ترے نقش و نگار
ہے یونہی وقتِ خزاں عمرِ دو روزہ کی بہار

جلوۂ گُل تو ہے مشتاقِ تماشا کیلئے
منظرِ عبرت نُما ہے چشمِ بینا کیلئے

منظومہ ستمبر ۱۹۲۶ء

بہارِ شفق

ہے جلوۂ بہارِ شفق آسمان پر
صہبائے سُرخ یا یہ خُمِ نیلگوں میں ہے

پردے سے مہر جلوہ فگن ہے جہان پر
یا برقِ بیقرار تڑپ کر سکوں میں ہے

لایا ہے رنگ خونِ شہیدانِ نامراد　　یا آگ لگ رہی ہے کسی لالہ زار میں
یا مشتعل فرشتوں میں ہے آتشِ فساد　　یا گرم کارزار ہے یہ نور و نار میں

کیا آسماں کو لعل لگے ہیں خدا کی شان　　پھیکا ہے جن کی آب سے رنگِ گلاب سرخ
یا ہے نظر کو شعلۂ جوّالہ کا گمان　　یا دامنِ فلک پہ گری ہے شراب سرخ

لالے کے پھول دامنِ چرخِ بریں میں ہیں　　یا معدنِ عقیق کی ضو ہے نظر فروز
یا پارہ ہائے آتشِ گل گل زمیں میں ہیں　　یا ہے سپہر پر کرۂ نار جلوہ سوز

پہنے قبائے سرخ کوئی لالہ فام ہے　　یا روئے آتشیں کا ہے جلوہ نقاب میں
یا چرخِ فتنہ ساز پہ آتش بجام ہے　　یا آفتاب ڈوب گیا ہے شہاب میں

پہنچا ہے اُڑ کے تا فلکِ اخضری گلال　　ہولی کا یا یہ کاسۂ گردوں میں رنگ ہے
یا روئے مہر پہ ہے یہ سرخیِ انفعال　　غصّے سے لال روئے حسینِ فرنگ ہے

لیلائے شب ہے حجلۂ زریں میں جلوہ گر　　رکھے ہوئے ہے پاس مئے آتشیں کے جام
مستِ مئے نظارہ نہ ہو برق کیوں نظر　　جوشِ شباب پہ ہے عروسِ بہارِ شام

منظومہ ماہ مارچ ۱۹۲۲ء

نسیم صبح

اے نسیمِ صبح اے روحِ روانِ بوستاں　　مایۂ راحت سرورِ قلب اے بادِ وزاں
بات ہے تجھ سے شمیمِ گیسوئے عنبر فشاں　　تیری ہر جنبش میں دنیائے لطافت ہے نہاں

غم غلط کن تو برائے خاطرِ افسردہ ہے
تیرا جھونکا تازگی بخشِ دلِ پژمردہ ہے

تیری پیاری شوخیاں بھی کیسی دل آویز ہیں　　گدگدانے سے ترے غنچے تبسم ریز ہیں
موجہائے مشکبو تیری سرور انگیز ہیں　　وہ شگوفے بھی ہیں خنداں جو ابھی نوخیز ہیں

تو نے چھیڑا نیم وا کلیوں کو پتیاں کھل گئیں
تیرے دم سے انکو منہ مانگی مرادیں مل گئیں

تو چمن میں آئی عشقِ گل کا دم بھرتی ہوئی　　چھاؤں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی
پہلے آہستہ چلی اٹکھیلیاں کرتی ہوئی　　پھر ہوئی برتیں دائیں روز کی بڑھتی ہوئی

گل کو چھیڑا طرۂ سنبل پریشاں کردیا
غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کردیا

لطفِ سیرِ بوستاں تجھ سے دوبالا ہوگیا تیری شوخی سے نیا رنگِ تماشا ہوگیا
شاخِ گل کو تازیانہ تیرا جھونکا ہوگیا اس طرح لچکی کہ اک اندازِ پیدا ہوگیا

قطرۂ شبنم رخِ گل سے ڈھلک کر گر پڑے
جیسے ساغر سے مئے احمر چھلک کر گر پڑے

تیرے دستِ شوق سے ٹوٹا حجابِ روئے گل پُرزے پُرزے ہوگئی رنگیں نقابِ روئے گل
صبحدم چمکا چمن میں آفتابِ روئے گل ہوگیا اظہارِ حسنِ لاجوابِ روئے گل

شانِ خوبی جب رخِ گل سے ہویدا ہوگئی
اور بیتابیِ دلِ بلبل میں پیدا ہوگئی

آتے ہی صحنِ چمن گلزار تو نے کردیا گرم حسن و عشق کا بازار تو نے کردیا
سبزۂ خوابیدہ کو بیدار تو نے کردیا نرگسِ بدمست کو ہشیار تو نے کردیا

تیرے کیف آمیز جھونکے کان میں کیا کہہ گئے
ہونٹوں ہی ہونٹوں میں غنچے مسکرا کر رہ گئے

آہ اے نکہت فروشِ خندۂ گل اے نسیم جیسی بھینی ہے تری موجوں میں پھولوں کی شمیم

گلشنِ ہستی میں جاری ہے ترا فیضِ عمیم تو ہوائے جانفزا ہے رحمتِ ربِّ کریم
فرح بخشِ قلب پھولوں کی کبھی خوشبو نہ ہو
باغِ امکاں میں نسیم دل کشا گر تو نہ ہو

تیرے جھونکے شہرت افزا ہیں برائے بوئے گُل باندھتی ہے تو گلستاں میں ہوائے بوئے گُل
کس لیئے جامے میں پھر پھولی سمائے بوئے گُل ایک عالم کو جو تو کر دے فدائے بوئے گُل
تیرے دل آویز جھونکے کیوں نہ ہوں عنبر شمیم
گود پھولوں سے بھری رہتی ہے تیری اے نسیم

دم قدم سے ہے ترے صحنِ گلستاں میں بہار تو ہے صد زینت دہِ گلشن ہوائے خوشگوار
یہ تبسم زیرِ لب غنچوں کا یہ گُل کا نکھار ہر ادا کا ہے تری مشاطگی پر انحصار
ہر گُلِ تر ہے چمن میں ناز پروردہ ترا
نیم وا کلیاں بھی دم بھرتی ہیں در پردہ ترا

بلبلِ نالاں جو ہوتی ہے قفس میں نا امید تو ہی دیتی ہے اُسے فصلِ بہاری کی نوید
غنچہ و گُل کا سناتی ہے پیامِ بازدید از سرِ نو دل میں بھڑکاتی ہے اک شوقِ جدید
بخشا ہے قدرت نے اعجازِ مسیحائی تجھے
دی ہے پژمردہ دلوں کی چارہ فرمائی تجھے

چھاؤں میں تاروں کی وہ آنا ترا انداز سے
وہ جگانا نیند کے ماتوں کو خوابِ ناز سے

جیسے سرگوشی کرے کوئی کسی دمساز سے
یا کہے دیکھ کے ٹھوکے یوں دبی آواز سے

لے کے جھکے انگڑائیاں میں گیسوؤں والو! اُٹھو

نور کا تڑکا ہوا اے شب کے متوالو! اُٹھو

منظومہ جون ۱۹۱۲ء

ہجومِ یاس

شرمندۂ کرم ہوں ترا اے ہجومِ یاس
کیونکر ہو لطفِ خاص کا تیرے ادا سپاس

تسکینِ قلبِ زار ہوئی تجھ سے بے قیاس
تیری ہوائے شوق مرے دل کو آئی راس

اچھا ہوا کہ تو نے کیا خونِ آرزو

دل تھا فریب خوردۂ افسونِ آرزو

نیرنگہائے جلوۂ امید اب کہاں
دل میں ہجومِ آرزوئے دید اب کہاں

افسانۂ فراق کی تمہید اب کہاں
وہ اضطرابِ شوق کی تاکید اب کہاں

اچھا ہوا کہ تو نے کیا خونِ آرزو

دل تھا فریب خوردۂ افسونِ آرزو

دل مبتلائے شعبدۂ ناز اب نہیں
ارمانِ دلفریبیِ انداز اب نہیں

دامن کشاں کرشمۂ آواز اب نہیں — راز و نیازِ چشمِ فسوں ساز اب نہیں

اچھا ہوا کہ تو نے کیا خونِ آرزو

دل تھا فریب خوردۂ افسونِ آرزو

احسان کون اُٹھائے کسی مہ جمال کا — اب تو جگہ سے چاک ہے دامن سوال کا

کیا انتظار آمدِ شامِ وصال کا — ہنگامہ منتشر ہوا بزمِ خیال کا

اچھا ہوا کہ تو نے کیا خونِ آرزو

دل تھا فریب خوردۂ افسونِ آرزو

سیلِ سرشکِ اشک رواں چشمِ نم سے ہے — بیتاب جانِ زار نہ جوشِ الم سے ہے

دل شادماں خوشی سے نہ غمگین غم سے ہے — حاصل سکونِ قلب مجھے تیرے دم سے ہے

اچھا ہوا کہ تو نے کیا خونِ آرزو

دل تھا فریب خوردۂ افسونِ آرزو

اے فرطِ یاس تجھ پہ میں سو جان سے نثار — قلبِ پر اضطرار کو تو نے دیا قرار

دل تھا کبھی اسیرِ فریبِ وفائے یار — اب کون ہے نگاہِ کرم کا امیدوار

اچھا ہوا کہ تو نے کیا خونِ آرزو

دل تھا فریب خوردۂ افسونِ آرزو

اُلٹی ہوئی ہے ولولۂ شوق کی بساط جب قطع ہو امید تو کیا فکرِ ارتباط
وہ دل ہی اب نہیں جو تھا سرمایۂ نشاط کیا خاک پھر ہو آرزوئے جوشِ انبساط

اچھا ہوا کہ تو نے کیا خونِ آرزو
دل تھا فریب خوردۂ افسونِ آرزو

(منظومۂ فروری ۱۹۱۲ء)

صبحِ اُمید

صبحِ اُمّید جو رُخ اپنا دکھا دیتی ہے منظرِ تیرگیٔ یاس مٹا دیتی ہے
طالعِ خُفتۂ ناشاد جگا دیتی ہے ہمّتِ خاطرِ مایوس بڑھا دیتی ہے

نظر آتا ہے اندھیرے میں اُجالا اِس سے
مُنھ شبِ تارِ مصیبت کا ہے کالا اِس سے

زخم دیدوں کیلئے مرہمِ کافور ہے یہ چارۂ درد، دوائے دلِ مہجور ہے یہ
جس سے تقدیر چمک جاتی ہے وہ نور ہے یہ تیرہ بختوں کیلئے برقِ سرِ طور ہے یہ

اِس کے جلوے سے منوّر ہے سیہ خانۂ دل
پرتوِ نور سے آباد ہے ویرانۂ دل

یہی سامانِ سکوں ہے پئے قلبِ بیتاب — اِسکی دُھندلی سی جھلک راحتِ چشمِ بیخواب
نامُرادی کے ہیں برباد اِسی سے اسباب — لبِ ساحل ہے یہی بہرِ اسیرِ گرداب

ابرِ رحمت ہے یہی کشتِ تمنّا کیلئے
صبرِ امروز یہی ہے غمِ فردا کیلئے

قُلزمِ غم کا اگر ہے تو کنارا ہے یہی — ڈوبنے والے کو تِنکے کا سہارا ہے یہی
کور چشموں کے لیے آنکھ کا تارا ہے یہی — خرمنِ یاس جلانے کو شرارا ہے یہی

لختِ دل کھا کے جو ناشاد لہو پیتے ہیں
تارِ امید سے ہی زخمِ جگر سیتے ہیں

بسترِ مرگ پہ ڈھارس ہے یہ بیماروں کی — اشک شوئی یہی کرتی ہے عزاداروں کی
یہ مددگار یتیموں کی ہے ناچاروں کی — ہے ہوا خواہ یہی جان سے بیزاروں کی

نقش اسکے دلِ مضطر میں جو جم جاتے ہیں
اشکِ رُخسار پہ بہتے ہوئے تھم جاتے ہیں

ہر طرف ہوتا ہی جب غم کی گھٹاؤں کا ہجوم — دل سے ہو جاتا ہے نقشِ رُخِ راحت معدوم

زندگی ہوتی ہے جب موت سے بدتر مظلوم — یاس فزا نظر آتی ہے حیاتِ موہوم

اس کے جلوے کی جھلک راحتِ جاں ہوتی ہے
روشنی کا شبِ حرماں میں نشاں ہوتی ہے

سپرِ تیغِ الم - دافعِ آفات ہے یہ — برقِ ہنگامۂ ناسازیِ حالات ہے یہ
درس آموزِ پئے کسبِ کمالات ہے یہ — جذبِ صادق ہو تو خضرِ رہِ ظلمات ہے یہ

بامِ رفعت پہ پہنچنے کا یہی زینہ ہے
یہ سکندر کی فتوحات کا آئینہ ہے

زرِ خالص کی چمک ہے، یہ امیروں کیلئے — پارۂ نانِ شبینہ ہے فقیروں کیلئے
سرو سامانِ رہائی ہے اسیروں کیلئے — ناتوانی میں عصا ہے یہی پیروں کیلئے

شامِ غربت میں ہے یہ صبحِ وطن کی تصویر
دیدۂ مرغِ قفس میں ہے چمن کی تصویر

جامِ زریں ہے یہی دہر کے میخانے کا — دَور ہے بزمِ جہاں میں اسی پیمانے کا
محفل افروزِ طرب، گنج ہے ویرانے کا — صبحِ اُمید ہے عنوان ہر افسانے کا

دفترِ عالمِ اسباب کی زینت ہے یہی
نوعِ انساں کیلئے آیۂ رحمت ہے یہی

اس کی ہی ذات سے قائم ہے زمانہ کا نظام — اسکے ہی فیض کا چشمہ ہے رواں ہے جو مدام
تنِ تنہا یہ مٹاتی ہے ہجومِ آلام — کامیابی کا یہ ناکام کو دیتی ہے پیام
ٹوٹ جائے دلِ ناشاد اگر آس نہ ہو
زندگی کا کسی ذی رُوح کو احساس نہ ہو

صبحِ اُمید سے ہے زینتِ ایوانِ جہاں — اس کے پرتو سے ہے کافورِ شبِ غم کا نشاں
مثلِ خورشیدِ ضیا بار رہے یہ نور فشاں — روزِ روشن کی چمک تابشِ رُخ سے ہے عیاں
برق میں اسکا تہِ دل سے تمنائی ہوں
صبحِ اُمید کے جلوے کا تماشائی ہوں

منظومہ جنوری ۱۹۲۷ء

سالِ نو

مبارک ہو تجھے نوروز کا یہ دن، سحر جس کی — گلے ملنے کو تجھ سے کھول کر آغوش آئی ہے
مبارک ہو نویدِ شادمانی مژدۂ راحت — صدا عشرت فضا جسکی ترے تا گوش آئی ہے
مبارک ہو تبسم زیرِ لب تجھکو عزیزوں کا — ادب سے جنکے ہونٹھوں تک ہنسی رُوپوش آئی ہے

مگر ان سب سے بڑھکر تجھکو سالِ نو مبارک ہو
مسرت بنکے جسکی ساعتِ پُر جوش آئی ہے

منظومۂ جنوری ۱۹۱۷ء

کرشمۂ قدرت

یہ جانفروز نظارے، یہ رنگِ باغِ جہاں
یہ صبح و شام کے جلوے، یہ دلفریب سماں
یہ فرشِ خاک، یہ گلکاریاں، یہ صحنِ چمن
چراغِ انجمِ تاباں، یہ سقفِ چرخِ کہن

فضائے دامنِ کہساں، یہ اوجِ کوہِ گراں
صفائے آئینۂ آب، جوشِ سیلِ رواں
یہ کشتِ زار، یہ سبزہ، یہ وادیٔ گلپوش
سکونِ دشت، یہ صحرا کا منظرِ خاموش

یہ آفتابِ لبِ بام و شامِ نورانی
یہ چرخ پر مہِ تاباں کی جلوہ افشانی
یہ شب کے پردے میں گوہر فشانیٔ شبنم
یہ نورِ صبح یہ تاروں کی محفلِ برہم

یہ سرد سرد ہوا موسمِ زمستاں کی
یہ عہدِ گل، یہ فضا گلشن و بیاباں کی

نسیمِ صبح کے جھونکوں کی عطر افشانی یہ طائرانِ نوازن کی زمزمہ خوانی

شبابِ فصلِ بہاری، یہ جوشِ خندۂ گُل یہ جامِ غنچۂ نوخیز رشکِ ساغرِ مُل
یہ جھلملاتے ہوئے اوجِ چرخ پر تارے سوادِ شام، بہارِ شفق کے نظّارے

یہ قطرہ باریِ ابرِ کرم، یہ دَل بادَل یہ شب کی کالی گھٹائیں، یہ برق کی مشعل
فرازِ کوہ سے گرنا یہ آبشاروں کا اندھیری رات، یہ پانی میں عکس تاروں کا

یہ مُشتِ خاک، یہ رنگینیٔ بہارِ شباب یہ چشمِ مست، یہ کیفیتِ خُمارِ شباب
یہ بانکپن، یہ ادائیں، یہ جاذبیٔ حُسن یہ سوز و سازِ محبت، یہ دلفریبیٔ حُسن

یہ سب کرشمے ہیں کس کے؟ خدا کی قدرت کے
یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کی قُدرت کے

(منظومہ فروری سنہ ۱۹۲۲ء)

گنگا جی

اے سیلِ آبِ حیواں اے موجِ بحرِ رحمت | اے پیکرِ تجلّی، سرچشمۂ لطافت
جلوے سے تیرے شانِ حسنِ آفریں ہے پیدا | تنویر سے ہے تیری نورِ ازل ہویدا
تو صفحۂ زمیں پر اک نور کی ہے جدول | یا کہکشاں نے اپنا پھیلا دیا ہے آنچل
آبی لباس پہنے یا برق جلوہ گر ہے | نیرنگِ حسنِ قدرت زینت دہِ نظر ہے
کیوں حسن کی تجلّی تیرے نہ ہو دوبالا | سانچے میں نور کے ہی قدرت نے تجھ کو ڈھالا
رنگت میں چاندنی سے اجلا بدن بنا ہے | آبِ رواں کا ہلکا سا پیرہن بنا ہے
ہر موج کا ہے دعوٰے مہتاب کی کرن ہوں | آئینۂ صفا ہوں سیماب پیرہن ہوں
ہر لہر کہہ رہی ہے اک موجِ نور ہوں میں | ہے ہر حباب گویا جامِ بلور ہوں میں
کیا تیری ضو چھپائے ہلکا لباس آبی | تنویرِ حسن کو ہے پردے میں اضطرابی
پانی کے آئینے میں تارے ہیں عکس افگن | یا جلوۂ چراغاں ہے تیرے زیرِ دامن
منظر ہے چاندنی میں کیا لاجواب تیرا | مہتاب در بغل ہے ہر اک حباب تیرا
بھارت کی سرزمیں کے تجھ سے نصیب جاگے | پانی بھرے نہ پھر کیوں ہر بحر تیرے آگے
سرچشمۂ کرم ہے کہنے کو آبِ جو ہے | ق | تر دامنوں کے حق میں آبِ حیات تو ہے

عہدِ سلف سے جاری ہے فیضِ عام تیرا
مستِ مئے حقیقت پیتے ہیں جام تیرا

شیو کی لٹوں میں آئی آکاش سے اُتر کر — بھارت میں وہ جا پھیلی کیلاش سے اُتر کر
گنگوتری سے نکلی مستِ خرام ہو کر — رگ رگ کے پائے نازک دھرتی ہوئی زمیں پر
کچھ منزلیں جو طے کیں بڑھتی گئی روانی — بہنے لگا ادا سے لہرا کے صاف پانی
وادی میں چاک کرتی دامانِ کوہ آئی — موجوں کا لیکے لشکر با صد شکوہ آئی
جب ہردوار آئی سیلاب کا تھا عالم — لہروں کے پیچ و خم میں گرداب کا تھا عالم
دشت و جبل کی گویا قسمت جگا رہی تھی — شہروں کی بستیوں کی زینت بڑھا رہی تھی
اے منبعِ تقدس! گہوارۂ تمدن — تھے فیضیاب تجھ سے، آوارۂ تمدن
مسکن ہے تو قدیمی اسلاف کا ہمارے — ڈالے رہے ہیں ڈیرے صدیوں ترے کنارے
ساحل پہ تیرے شیوں منیوں نے گیان پایا — سرچشمۂ ازل کا تجھ سے نشان پایا
تہذیب کی شعاعیں پھیلیں تری جبیں سے — آثارِ عہدِ زریں پیدا ہوئے یہیں سے
تھا شاندار کیسا دورِ کہن ہمارا — فردوس بر زمیں تھا گویا وطن ہمارا
مہرِ عروج اپنا نصف النہار پر تھا — وقفِ خزاں نہ گلشن اپنی بہار پر تھا
ہے تجھکو یاد از بر وہ داستان ساری — لہریں تری ورق ہیں تاریخ کے ہماری

رُوئے معاشرت کا غازہ ہے خاک تیری

پربت کی پاک دیوی ہر شے ہے پاک تیری

دامن میں تیرے پنہاں خاکسترِ سلف ہے، گنجِ گہر نہاں ہے جس میں تو وہ صدف ہے
تو عظمتِ گزشتہ کی آج تک امیں ہے جاہ و جلال تیرے پہلو میں تہہ نشیں ہے
تو کشتِ آرزو میں کرتی ہے آبیاری ہے شش جہت میں تیرا دریائے فیض جاری
آبِ رواں سے تیرے دُھلتی ہے گردِ عصیاں پاکیزہ تجھ سے ہوتے ہیں سر بسر تن و جاں
جب وقتِ نزع لب پہ آتی ہے جانِ شیریں آبِ بقا سے تیرے پاتی ہے روح تسکیں
آبِ گہر خجل ہے تجھ میں ہے وہ صفائی قطروں میں بس رہی ہے تاثیرِ جاں فزائی
وحدانیت کا نغمہ موجوں کے ساز میں ہے اعجازِ حق نمائی رنگِ مجاز میں ہے
ہے تیرے درشنوں کا مشتاق اک زمانہ وردِ زباں ہے تیری تقدیس کا ترانہ
آبِ رواں میں تیرے جذبِ کشش وہی ہے تیرے فدائیوں کا ذوقِ طپش وہی ہے
سنگم کا اب بھی منظر پہلا سا ہے دل آرا پریاگ راج میں ہے فردوس کا نظارا
اب بھی ترے کنارے یوگی ہیں محوِ طاعت گوشہ نشیں ہیں جو یائے رازِ وحدت
ساحل پہ تیرے ہوتا ہے اژدہام اب بھی سیراب تجھ سے ہوتے ہیں تشنہ کام اب بھی
ہے جذبۂ پرستش خاطر نشیں دلوں میں دیوی! تری عقیدت ہے جاگزیں دلوں میں

لہروں میں تیری مل کر ہستی ہو پاک میری
اے کاش یوں ٹھکانے لگ جائے خاک میری

بسنت رُت

بسنت رُت کیا جہاں میں آئی، پیامِ دورِ بہار آیا — نظر میں مستِ شرابِ جلوہ کہ روئے گُل پہ نکھار آیا
اچھوتی کلیوں کے بھی لبوں پہ تبسمِ بیقرار آیا — نئے شگوفے کھلانے گویا یہ موسمِ خوشگوار آیا
نصیب سبزہ کے جاگ اُٹھے ہیں ستارہ ہے اوج پر چمن کا
جما ہے نقشہ روش روش پر شگفتہ پھولوں کی انجمن کا

شمیمِ گلشن ہے کیف پرور، ہوا ہے ڈوبی ہوئی اثر میں — نمو کی تاثیر ہے یہ کیسی کہ تازگی ہے رگِ شجر میں
خوشی سے پھولیں نہ کیوں گُلِ تر، قبائے زریں ہے سب کے بر میں — عجیب فرحت فزا ہے منظر، بسی ہیں رنگینیاں نظر میں
سماں یہ سرسوں کے کھیت کا ہے کہ زعفراں زار کھل رہا ہے
فضائیں کُندن بنا رہا ہے سرور آنکھوں کو مل رہا ہے

کہاں ہے سردی کی سرد مہری، شباب جاڑے کا ڈھل چکا ہے — ہوا ہے آغاز عہدِ نو کا، زمانہ کروٹ بدل چکا ہے
کھلی ہے خوابیدہ چشمِ نرگس، روش پہ سبزہ سنبھل چکا ہے — قبائے غنچہ ہے چاک خوردہ، کلی کا دامن مسل چکا ہے

خزاں الم سے چراغ پا ہے کہ آتشِ گل بھڑک رہی ہے
بہار کی ہے جو آمد آمد، چمن کی قسمت چمک رہی ہے

دلوں میں پیدا ہوئیں امنگیں، لہو ہوا جوشزن رگوں میں
حیا فروز ہے یہ موسم پڑی ہے پھر جان ولولوں میں
تڑپ ہے بلبل کے چہچہوں میں، ہے سوز کویل کے زمزموں میں
نگاہیں مشتاقِ دیدِ گل ہیں، ہوائے گلگشت ہے سر میں
بسنتی ساڑھی سے جھنیو کی جازیبی ہوئی دوبالا
یہ رنگ سونے پہ ہے سہاگا نظر فریبی ہوئی دوبالا

کھلے ہیں ٹیسو کے پھول بن میں، ضیا فگن ہے شفق زمیں پر
چنے ہیں قدرت نے سبز شاخوں پہ شیشہ ہائے شرابِ احمر
جب ان پہ پڑتی ہیں ہلکی ہلکی شعاعِ سیمینِ ماہِ انور
مرقعِ شانِ دلفریبی دکھاتا جا نظر فروز منظر
لگائے صحرا کو لعل اس نے جو وجہِ زیبائشِ چمن ہے
نہال فطرت کے فیض سے ہے زمینِ گلزار ہے کہ بن ہے

کنول کے پھولوں سے ہو رہے ہیں کہیں لبِ جو چراغ روشن
ہے ان کی رنگینیوں سے منقش آبِ تال کا دامن
ہوا کی سرد جنبشوں سے یہ گل جو ہوتے ہیں عکس افگن
مصفا پانی کے آبگینے میں لہر لیتا ہے روئے گلشن
نظارۂ دلکشا ہے ہر سو جو سین ہے جاذبِ نظر ہے
بسنت رت کے ہیں سب کرشمے بہار ذرّوں میں جلوہ گر ہے

منظومہ جنوری ۱۹۲۶ء

آجا

اے مُطربِ نغمہ نواز آجا اے ساحرِ سحر طراز آجا
اے عقدہ کشائے مجاز آجا اے ساقیِ بادۂ راز آجا

دے مژدۂ کیفِ دوام ہمیں
اے شیام اب نہ رکھ ناکام ہمیں

پھر چشم سراپا شوق ہیں سب بیتاب ہیں تشنۂ ذوقِ طلب
پھر اشک بچشم و آہ بہ لب ہیں کشتۂ غم پامالِ تعب

تو آئے تو جان میں جان آئے
جینے کا نظر سامان آئے

یک جلوۂ روئے سعید دکھا اب راہ ہمیں نہ مزید دکھا
رُخ رشکِ دِہ خورشید دکھا پھر منظرِ صبحِ اُمید دکھا

آنکھوں میں سمائے نور ترا
ہو منزلِ دل میں سرور ترا

پھر آنکھ لڑا کر ساغر دے صہبائے طرب دل میں بھر دے

بیگانۂ ہوش و خرد کر دے — اُٹھ جائیں جو حائل ہیں پردے

بیخود ہوں خودی کی خُو نہ رہے

وحدت میں دوئی کی بُو نہ رہے

اے حُسنِ سراپا ناز آجا — عُشّاق کے محرمِ راز آجا

پھر چھیڑ نیا کوئی ساز آجا — پھر قلب ہوں صرفِ گُداز آجا

پھر نغمۂ رُوحانی سُن لیں

گُلہائے ریاضِ جناں چُن لیں

پھر جوش پہ قلزمِ رحمت ہو — یہ دُنیا رشکِ جنّت ہو

بے پردہ کشفِ حقیقت ہو — کثرت میں نُمایاں وحدت ہو

سرمست مئے نغمہ ہو جہاں

نظّارگیِ جلوہ ہو جہاں

بھارت کے نصیب جگانے کو — ظُلمت کا نقش مٹانے کو

بنسی کی ٹیر سُنانے کو — گیتا کا رنگ جمانے کو

اے شاہدِ حسنِ قدیم آجا

اے مصدرِ فیضِ عمیم آجا

منظومہ ۱۱ مئی ۱۹۲۸ء

کرشن بھگوان

تو وہ بُت ہے کعبۂ دل ہے صنم خانہ ترا　　شمعِ جاں افروز ہی تو ہیں بتاں پروانہ ترا

عکسِ وحدت پردۂ کثرت میں ہے پرتو فگن　　یہ طلسماتِ جہاں ہے آئینہ خانہ ترا

نقشبندِ دہر ہے پھر دونوں عالم سے الگ　　رنگ ہے نیرنگِ ہستی سے جدا گانہ ترا

رشکِ صد کانِ ملاحت موہنی مورت تری　　غیرتِ حسنِ بتاں اندازِ جانانہ ترا

نغمۂ نے ہے برائے اہلِ دل فردوسِ گوش　　ولولہ خیزِ تصوف رقصِ مستانہ ترا

نقدِ جانِ عاشقاں صدقے ترے اعجاز پر　　دل ہے بیعانہ ترا۔ ایمان نذرانہ ترا

بحرِ ہستی میں کنول کی طرح تر دامن نہیں　　ہوشمندِ خود فراموشی ہے دیوانہ ترا

سب کی نظروں میں سماتا ہے بقدرِ شوقِ دید　　چشمِ نظارہ میں ہے جلوہ جدا گانہ ترا

قطرہ قطرہ بن گیا خمخانۂ وحدت اثر　　جوشِ مستی میں ذرا چھلکا تھا پیمانہ ترا

فلسفہ گیتا کا ہے دنیا میں کانِ معرفت

بند ہے کوزے میں دریائے روانِ معرفت

آئینہ عالم پہ تو نے رازِ عرفاں کر دیا　　جلوۂ توحید کثرت میں نمایاں کر دیا

روئے روشن میں دکھا کر شانِ تنویرِ ازل　　دہر کے ظلمت کدے کو جلوہ ساماں کر دیا

دیجے تعلیمِ حقیقت خیز عینِ ذات کی ماسوا کا علم زیبِ طاقِ نسیاں کر دیا
بھر دیا نورِ جہاں افروز چشمِ شوق میں خانۂ دل کو تجلّی گاہِ عرفاں کر دیا
شانِ یکتائی کی تھی وہ تیرے جلوے میں جھلک جس نے باطل امتیازِ کفر و ایماں کر دیا
راز کا پردہ اُٹھا کر چہرۂ مقصود سے حُسنِ معنی تو نے بے پردہ نُمایاں کر دیا
عہدِ طفلی میں دکھا کر دہر کی نیرنگیاں ثابت اس دُنیا کو بازیگاہِ طفلاں کر دیا
عالمِ اجسام میں بن کر سراپا نُور کا عرشِ اعلیٰ پر دماغِ بزمِ امکاں کر دیا

دوَر دورہ مادّیت کا ہے پھر سنسار میں
خود نُمائی کا دکھا جلوہ نئے اوتار میں

منظومہ اگست سنہ ۱۹۱۹ء

بانسری

اے کیفِ مجسّم! دلِ وارفتہ کی دمساز اے جانِ ترنّم! ہمہ تن شعلۂ آواز
اے مایۂ صد سوز! طلسمِ اثر انداز اے پیکرِ نیرنگیٔ نوا، زمزمہ پرداز

تجھ میں ہے لبِ پردہ درِ راز کا اعجاز
تو ساز کا اک ساز ہے، اعجاز کا اعجاز

گلہائے نوا سے تری آغوش بھری ہے رگ رگ میں تری آتشِ خاموش بھری ہے
ساغر میں ترے یا مئے سرجوش بھری ہے بجلی کوئی بربادکنِ ہوش بھری ہے

کیا بانس کی پوری میں ہیں تاثیر کے انداز
سحر نگہِ ناز کی تسخیر کے انداز

کیا نغمۂ رقصاں ہے۔ کہ دل وجد کناں ہے کیا جنبشِ لرزاں ہے۔ کہ ہر ذرہ طپاں ہے
کیا مستیِ عریاں ہے۔ کہ بدست جہاں ہے کیا لطفِ نمایاں ہے۔ کہ جنت کا سماں ہے

ہر سُر میں نیا رنگ تصوف کا بھرا ہے
صیقل گرِ آئینۂ جاں ہے جو صدا ہے

سرمایۂ راحت ہے ترا شورِ ترنم ہر بول میں درپردہ ہے اندازِ تکلم
زیر و بمِ نغمہ سے جو برپا ہے تلاطم ہے جوش پہ آیا ہوا جذبات کا قلزم

جو تان ہے وہ ولولہ انگیزِ جنوں ہے
کیا جانیے کیا شاخِ بریدہ میں فسوں ہے

کویل کی صدا اتنی دل افروز کہاں ہے بلبل کا ترانہ طپش اندوز کہاں ہے

دُنیا کے کسی ساز میں یہ سوز کہاں ہے   نغمہ کوئی اتنا سبق آموز کہاں ہے
قدرت کا کرشمہ ہے تری سحر طرازی
تو کھولتی ہے رازِ حقیقی و مجازی
ہر نغمۂ دلکش میں قیامت کا اثر ہے   خود رفتہ ہیں سب اپنی نہ دنیا کی خبر ہے
ہے نقش بدیوار ملک ہے کہ بشر ہے   آئینۂ حیرت ہے شجر ہے کہ حجر ہے
بہتے ہوئے پانی کو میسر ہوا تھمنا
ہیں گوش بر آواز حبابِ لبِ جمنا
تاثیر میں ڈوبے ہوئے سُر تجھ میں بھرے ہیں   وابستۂ آواز حسینوں کے پرے ہیں
مُضطر ہے نظر ہاتھ کلیجوں پہ دھرے ہیں   زخمِ دلِ صد چاک نئے سر سے ہرے ہیں
خود رفتگیِ شوق ہے ہر آن دوبالا
ہے نغمۂ نے سُننے کا ارمان دوبالا
تصویریں ہیں گویا خاموش کھڑی ہیں   مخمورِ مئے عشق ہیں مدہوش کھڑی ہیں
ہنسی کی صدا پر ہمہ تن گوش کھڑی ہیں   مُشتاق ہیں کھولے ہوئے آغوش کھڑی ہیں
گوکل کے گوالے اِنکے اِدھر اُدھر بھی
کچھ اپنی پرستاروں پہ ہے تجھکو نظر بھی

اے مُطربِ انوار فشاں! بانسری والے عشّاق ترے کرتے ہیں دل تھام کے نالے
جیتے رہیں کب تک یونہی لے لیکے سنبھالے غم دیدہ ہیں، گردابِ تباہی سے بچالے

پھر اوج پہ ہو خاک نشینوں کا ستارا
پھر اوم کے نغموں سے جہاں گونج اُٹھے سارا

منظومہ اگست ۱۹۲۶ء

تارے

دیدنی شام کے نظارے ہیں زینت افزائے چرخ تارے ہیں
آتشیں پھول پیارے پیارے ہیں ضَو فشاں نور کے شرارے ہیں

اِن کی کچھ شان ہی نرالی ہے
یوں تارے تو رات کالی ہے

تابشِ انجم فروزاں ہے کہ شبِ تار جلوہ ساماں ہے
چرخ پر عالم چراغاں ہے گنبدِ نیلگوں درخشاں ہے

تیرگی میں ہے نور کا عالم
جلوۂ برقِ طور کا عالم

جلوہ افروز شب چراغ ہیں یہ	فرح بخشِ دل و دماغ ہیں یہ
سینۂ آسماں کے داغ ہیں یہ	یا مئے نور کے ایاغ ہیں یہ

بحرِ ظلمت میں ہیں حبابِ نور
یا ہیں یہ گوہرِ خوش آبِ نور

یا مرصع ہے سقفِ زنگاری	لعل و گوہر ہیں صرفِ زرکاری
تیرگی ہے جہان پر طاری	یہ ہیں مصروفِ صد ضیا باری

چرخ پر قمقمے سے روشن ہیں
یہ دیے بے نیازِ روغن ہیں

کرۂ نار پا بہ جولاں ہیں	اپنے محور کے گرد رقصاں ہیں
شام سے تا سحر فروزاں ہیں	رات بھر خلق کے نگہباں ہیں

رہنما ہیں جہاز رانوں کے
تارے آنکھوں کی ہیں کسانوں کے

ہجر میں مبتلائے صد آفات	تارے گن گن کے کاٹتے ہیں رات

ان کے حق میں ہیں یہ چراغِ حیات　　آنکھوں آنکھوں میں پوچھتے ہیں بات
دُور سے دیتے ہیں پیامِ سکُوت
ہیں یہ دمسازِ تشنہ کامِ سکُوت

کوئی ویران ہے، کوئی معمُور　　کوئی تاریک، کوئی بُقعۂ نُور
زرد رُو کوئی صُورتِ رنجُور　　کوئی چشمک زنِ تجلّیِ طُور
کوئی ثابت ہے کوئی سیّارہ
محوِ حیرت ہے چشمِ نظّارہ

کہکشاں ہے کہ جادۂ زرّیں　　یا فلک پر ہے جدولِ سیمیں
تابش افزا ہے جلوۂ رنگیں　　بہرِ گردوں ہے مایۂ تزئیں
دستِ فطرت کے نقش سارے ہیں
مہر و مہ کہکشاں کہ تارے ہیں

منظومہ اکتوبر ۱۹۲۴ء

تاروں بھری رات

دلچسپ ہے کیا تاروں بھری رات کا جلوہ　　صنعت گرِ ہستی کی کرامات کا جلوہ

کیا گُل ہیں کھلے دامنِ گلزارِ فلک پر — صدقے ہیں زر و لعل و گُہر جنکی چمک پر

لیلائے شب اوڑھے ہوئے تاروں کی ردا ہے — کیا حُسنِ ضیا پاش ہے دل جس پہ فدا ہے

کیا تیرگی و نُور کے دلکش ہیں نظارے — روشن شبِ تاریک میں ہیں چرخ پہ تارے

ہے ان کی تجلّی سے عجب رات کا عالم — ہے ساحتِ گردوں پہ طلسمات کا عالم

کیا ضَو ہے سرِ چرخِ بریں کاہکشاں کی — اِک مَوج ہے یہ نُور کے دریائے رواں کی

ہے جلوۂ انجم سے اندھیرے میں اُجالا — قدرت نے انہیں نُور کے سانچے میں ہے ڈھالا

قندیلیں سرِ شام سے روشن ہیں فلک پر — یا گُنبدِ گردوں پہ چراغاں کا ہے منظر

دامانِ فلک میں گُلِ خوشرنگ پڑے ہیں — یا سقفِ زمرّد میں دُر و لعل جڑے ہیں

تاریک کوئی، ماند کوئی، کوئی درخشاں — ثابت کوئی، سیّارہ کوئی، کوئی ہے رقصاں

سرگشتۂ گردوں ہیں یہ دامانِ خلا میں — لاکھوں کُرۂ نور معلّق ہیں ہوا میں

پانی میں جہاز ان کے اشارے پہ رواں ہیں — گویا یہ سفینوں کیلئے سنگِ نشاں ہیں

چھا جاتے ہیں جب دل پہ غم و یاس کے بادل — صحرا میں مسافر کو دکھاتے ہیں یہ مشعل

ہمدم یہی غمدیدوں کے ہیں رنج و تعب میں — دل ان سے بہل جاتا ہے تنہائیٔ شب میں

گردوں پہ عجب محفلِ انجم کا ہے عالم — آتا ہے نظر دُور سے اک مجمعِ برہم

ہیں رات کی ہی رات کے جلوے یہ فلک پر — جب نور کا تڑکا ہوا تبدیل ہے منظر

شب ڈھلتے ہی رنگِ رُخِ انجم ہوا پھیکا گُل کر گیا جھونکا اِنہیں بادِ سحری کا

آیا ہے دمِ صبح یہ فرق ان کی چمک میں

مُرجھائے ہوئے پھول ہیں دامانِ فلک میں

منظومہ اپریل ۱۹۲۵ء

ماہِ تاباں

اے مہِ تاباں! سرور افزا ہے تیری روشنی اُجلی اُجلی یہ شعاعیں ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی

ساکنانِ دہر پر برسا رہا ہے نُور تو ہے سرِ کوہِ فلک گویا چراغِ طُور تو

تیری ضَو سے دامنِ لیلائے شب زرتار ہے خلعتِ زر سے مزیّن ہر در و دیوار ہے

انجمِ تابندہ تابش سے تری گُل خوردہ ہیں دامنِ چرخِ بریں میں غنچۂ پژمُردہ ہیں

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے وادیِ گُلپوش میں کاروانِ نُور اُترا منظرِ خاموش میں

پیرہن سیماب کا پہنے ہوئے ہے موجِ آب نُور در آغوش ہے چشمِ نظر بازِ حباب

جوش سا دل میں ہے حسنِ روئے عالمتاب سے تیرا جلوہ دیکھتا ہوں دیدۂ سُرخاب سے

محوِ نظارہ ہوں، وارفتہ ہوں، دیوانہ ہوں میں شمعِ حُسنِ ماہ پر بچپن سے پروانہ ہوں میں

درسِ آموزِ حقیقت ہے ترا اوج و زوال تیری طلعت سے ہے روشن میری دنیائے خیال

گو مہِ رخشندہ شب افروز تیری ذات ہے
چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

رہروِ صحرائے گردوں کس کی ہے تجھ کو تلاش | شاہدِ خاموش اگر محجوب تو اپنا راز فاش
تیرے دل میں کس کا روشن ہے چراغِ آرزو | لگ رہی ہے کس کی لَو کس کا ہے داغِ آرزو
رات بھر مشعل لیے پھرتا ہے تو کس کیلئے | ماہِ انور ہے سراپا جستجو کس کے لیئے
مہر سے کرتا ہے کس کے دیکھنے کو کسبِ نور | کون وہ ناز آفریں ہے مخزنِ حسن و سرور
آہ! سرگرداں عبث تو سعیِ لاحاصل میں ہے | برقِ جاں افروز پنہاں تیرے آب و گل میں ہے

وہ ضیا افگن مرے دل کے سیہ خانے میں ہے
بادۂ نورِ ازل ہستی کے پیمانے میں ہے

منظومہ ۳۰ مئی سنہ ۱۹۲۶ء

شبِ ماہتاب

مہرِ جہاں فروز نے رخ پہ جو لی نقابِ شام | بامِ سپہر پہ ہوا جلوہ فگن مہِ تمام
چشمۂ نور ابل پڑا دامنِ چرخِ پیر میں | موجِ ضیا نہیں ہے یہ جوش ہے جوئے شیر میں
تارِ شعاع نے عجب مژدۂ جاں فزا دیا | تابشِ فرح بخش نے دل کا کنول کھلا دیا

دامنِ دشت و کوہ پر بچھ گیا فرش نور کا — چشمِ نظارہ باز ہیں جلوہ ہے برقِ طور کا
زرّیں ہیں سقف و بام و در چمکے ہیں سب شجر حجر — جس طرف اُٹھ گئی نظر رنگِ طلا ہے سر بسر
پھیلی ہے روے خاک پر سیمِ رقیق کی بساط — وقت ہے میکشی کا یہ ساعتِ گرمیٔ نشاط
سیرِ چمن کا لطف ہے صحبتِ خاص کا مزا — تازہ مشامِ جاں بھی ہو دل بھی ہو لذّت آشنا
یا ہو کنارِ آبجو، پانی میں عکسِ ماہ ہو — ساتھ ہو ماہرو کوئی دونوں طرف نگاہ ہو
منظرِ جاں نواز ہے چاندنی رات کا عجب — خنکی ہے موجِ باد میں دل میں ہے گرمیٔ طرب

موجوں میں اضطراب ہے، جوش پہ سیلِ آب ہے
تیرے جمال میں کشش اے مہِ جلوہ تاب ہے

ماہِ دو ہفتہ! تو کوئی چشمۂ نور ریز ہے — تیری شعاعِ جلوہ زا موجِ سرور خیز ہے
روشنی بخشِ شش جہت گوہرِ شبچراغ ہے — یا تو شرابِ نور کا زرّیں کوئی ایاغ ہے
تابشِ مہرِ نیم روز کتنی تھی اُف نظارہ سوز — تیری تجلّیاں مگر کیسی ہیں باصرہ فروز
تاروں کی جلوہ پاشیاں کیوں نہ ہوں تیرے آگے ماند — اخترِ ضو فروش ہوں اور تو چودھویں کا چاند
حسن میں بے بدل ہے تو اس میں کسے کلام ہے — خوبی و خوبصورتی رخ پہ ترے تمام ہے
تیری نگاہ میں نہیں شاہ و گدا کا امتیاز — جلوہ نمائیاں تری سب کے لیے ہیں جاں نواز
ایک سا تیرا نور ہے دشت میں سبزہ زار میں ق — قصرِ گہر نگار میں حجلۂ تنگ و تار میں

زخمیِ خنجرِ الم گو ہے مرا دلِ طپاں — اے مہِ نیم ماہ! تو شوق سے ہو نمک فشاں
لُطفِ جراحت اور بھی خستہ و زار کو ملے — چاندنی رات میں کوئی سیر ہو تازہ گُل کھلے
تیرے فروغِ حُسن سے رُوکشِ روز رات ہے
آج تو تیرے سامنے جلوۂ مہر مات ہے

اپریل سنہ ۱۹۲۲ء

ہندوستان جنّت نشان

ہندوستان! مایۂ نازِ جہاں ہے تو — چشم و چراغِ محفلِ کون و مکاں ہے تو
رُوئے زمیں پہ خطۂ جنّت نشاں ہے تو — اپنا عدیل آپ تہِ آسماں ہے تو
ہے جلوہ گاہِ حُسنِ ازل سرزمیں تری
آئینۂ تجلّیِ وحدت جبیں تری

ہے تیری خاکِ پاک کا وہ رُتبۂ گراں — ذرّوں سے جس کے جوہرِ تقدیس ہے عیاں
ہے سجدہ گاہ خلق ترا سنگِ آستاں — سچ ہے اگر کہیں تجھے سرتاجِ کشوراں

روشن چراغِ دیدِ مقدّس یہیں ہُوا
آہن طلا ہو جس سے وہ پارس یہیں ہُوا

قدرت نے تجھکو بخشی ہے عظمت وہ بیگماں — جس پر بجا ہے رشک کرے روضۂ جناں
سایہ فگن ہے فرق پہ کوہِ فلک نشاں — قدموں میں کھیلتا ہے ترے بحرِ بیکراں

سرسبز وادیاں تری مینُو سواد ہیں
تیرے قدیم شہر عرُوس البلاد ہیں

گنگ و جمن ہیں کوثر و تسنیم کا جواب — ہے جن کے آگے چشمۂ حیواں بھی آب آب
سیلِ رواں کی دید کے قابل ہے آب و تاب — ہے شورِ موج میں اثرِ نغمۂ رباب

باہر بیان سے ہیں جو ان میں صفات ہیں
تر دامنوں کے حق میں یہ آبِ حیات ہیں

ہیں تیرے سبزہ زار بھی غیرت دہِ ارم — ہر رُت کے پھول پھل یہاں ملتے ہیں بیش و کم
پھیلی ہوئی بساطِ زمرّد ہے یک قلم — سارے ریاضِ خُلد کے ساماں ہیں بہم

شاداب تجھسے بڑھکے کوئی سرزمیں نہیں
یہ لہر بہر جوشِ نمو کی کہیں نہیں

عرفاں کا تو خزانہ ہے شیونکی زادِ بُوم — سرچشمۂ کمال ہے گنجینۂ علُوم

مصدر ہے فلسفے کا تو ہے ماخذِ نجوم — پھیلی یہیں سے روشنیِ علم بالعموم
روزِ ازل سے تو سبق آموزِ دہر ہے
علمِ ادب ترا طرب اندوزِ دہر ہے

ہیں تیرے چاروں وید کہ ارکانِ معرفت — ایک ایک اُپنشد ہے ترا جانِ معرفت
گیتا سے سربسر ہے عیاں شانِ معرفت — ہے ہر پُران دفترِ عنوانِ معرفت
مشہور شاستر ہیں ترے شش جہات میں
گنجینہ فلسفے کا ہیں جو کائنات میں

خمخانۂ جہاں کی ہے زینت ترا ایاغ — ہیں جرعہ کش اسی کے سب اہلِ دل و دماغ
حاصل ہے تجھ سے عالمِ اسباب میں فراغ — سب کا ترے چراغ سے روشن ہوا چراغ
دُنیا کے جتنے مُلک ہیں سب خوشہ چیں ترے
یونان و مصر و رُوم و عرب خوشہ چیں ترے

منظومہ ستمبر ۱۹۲۳ء

اہلِ ہند

انقلابِ دہر سے سب شان والے مٹ گئے — رُوم والے مٹ گئے یُونان والے مٹ گئے
سیریا والے مٹے توران والے مٹ گئے — کون کہتا ہے کہ ہندوستان والے مٹ گئے

نقشِ باطل ہم نہیں جسکو مٹائے آسماں
ہم نہیں مٹنے کے جبتک ہے بنائے آسماں

ہم نے یہ مانا ہمارے آن والے مٹ گئے — بھوج سے وکرم سے عالی شان والے مٹ گئے
بھیشم وارجن سے یودھا بان والے مٹ گئے — اکبر و پرتاب سے میدان والے مٹ گئے

نام لیوا اُن کے ہم زیرِ فلک باقی تو ہیں
مٹتے مٹتے بھی جہاں میں آجتک باقی تو ہیں

خاک سے اس دیش کی پیدا ہوئے وہ نامور — نقش جنکے کارنامے ہیں بساطِ دہر پر
دبدبے سے جنکے جھکتے تھے سرفرازوں کے سر — جنکا لوہا مانتے ہیں حکمرانِ بحر و بر

تیغ و ترکش کے دھنی تھے رزمگہ میں فرد تھے
اس شجاعت پہ یہ طرّہ ہے سراپا درد تھے

آشنائے رازِ وحدت، فلسفیِ بےمثال — گوہرِ دریائے دانش، نکتہ دانِ باکمال
ماہرِ علم و ہنر، شیوا بیاں، شیریں مقال — راستباز و صلح جو، پاکیزہ خو، روشن خیال

بادۂ تہذیب سے وہ سر بسر مخمور تھے
قلبِ روشن معرفت کے نور سے پرنور تھے

کیا تھے اہلِ ہند یہ چرخِ کہن سے پوچھ لو — یا ہمالہ کی گپھاؤں کے دہن سے پوچھ لو

اپنا افسانہ لبِ گنگ و جمن سے پوچھ لو پوچھ لو ہر ذرّۂ خاکِ وطن سے پوچھ لو

آپنے مُنھ سے کیا بتائیں ہم کہ کیا وہ لوگ تھے

نفس کُش نیکی کے پتلے تھے مجسّم لوگ تھے

ہم مُعرّا ہو کے ان وصاف سے پستی میں ہیں دولتِ علم و عمل کھو کر تہیدستی میں ہیں

شہرۂ آفاق اب ستی و بدمستی میں ہیں شمعِ افسردہ کی صورت محفلِ ہستی میں ہیں

دورِ رفتہ کا مگر سودا ہمارے سر میں ہے

بادۂ حُبِّ وطن چھلکے ہوئے ساغر میں ہے

عہدِ پیشیں کا ہمارے سامنے اِتہاس ہے بس یہی اک نقشِ فرسودہ ہمارے پاس ہے

دل میں تازہ عظمتِ دیرینہ کا احساس ہے یاس کے عالم میں بھی قائم اسی سے آس ہے

ہم قدیمی شان سے سرتا بپا اُمّید ہیں

ہستیِ موہوم میں بھی زندۂ جاوید ہیں

پھر ہمیں ہوگا میسّر دہر میں جاہ و جلال چار دن میں گلشنِ ہستی میں پھر ہونگے نہال

برقؔ یہ ضرب المثل ہوگی ہمارے حسبِ حال ہر کمالے را زوالے ہر زوالے را کمال

نیّرِ اقبال چمکے گا ہمارا ایک دن

اوج پر اس دیش کا ہوگا ستارا ایک دن

منظومہ مارچ ۱۹۲۶ء

تیغِ ہندی

غیرتِ برقِ شرربار جھلک ہے تیری
جس سے خیرہ ہوں نگاہیں وہ چمک ہے تیری
دستِ غیبی جسے کہتے ہیں کمک ہے تیری
دُھوم دُنیا میں تو کیا تا بہ فلک ہے تیری

صاف کرتی صفِ دشمن تو جدھر چلتی ہے
ہاتھ باندھے ترے سائے میں ظفر چلتی ہے

تیرے جلوے میں قیامت کی درخشانی ہے
پردہ در ننگِ عدو کی، تری عُریانی ہے
تجھ میں وہ آب ہے شیروں کا جگر پانی ہے
دشمنوں کیلئے جنبش تری طُوفانی ہے

تو وہ ہے بحرِ رواں جس سے روانی مانگے
تیرا مارا ہوا میداں میں نہ پانی مانگے

گنبدِ چرخِ بریں تجھ سے پُرآوازہ ہے
آفتِ جانِ حریفاں، ترا خمیازہ ہے
تجھ سے بکھرا ہوا اُستاد کا شیرازہ ہے
خونِ دشمن ترے چہرے کیلئے غازہ ہے

چشمِ بد دُور وہ بانکی ہیں ادائیں تیری
مَلک الموت بھی لیتا ہے بلائیں تیری

صاعقہ تجھ سے خجل ہے وہ نظر تاب ہے، تو
خون میں ڈوب کے رشکِ پرِ سرخاب ہے، تو

موجِ طوفانِ فنا، حلقۂ گرداب ہے تو تشنہ کامانِ شہادت کیلئے آب ہے تو

سرد اتو اپ کی تجھ سے شرر افشانی ہے

آبداری تری آتش کے لیے پانی ہے

تو وہ ہے جلوۂ ہستی و عدم ہے تجھ میں پارۂ آہنِ بیجاں ہے پہ دم ہے تجھ میں

جس پہ صدقے خمِ ابرو ہے وہ خم ہے تجھ میں ہے جفاجو مگر اک شانِ کرم ہے تجھ میں

زخم دیدوں کی دمِ مرگ خبر لیتی ہے

چادرِ خوں سے شہیدوں کو کفن دیتی ہے

دل لرزتے ہیں ذرا تو جو لچک جاتی ہے چشمِ اعدا میں بجلی سی چمک جاتی ہے

اپنے مرکز سے زمیں رن کی سرک جاتی ہے موت بھی سامنے آئے تو جھجک جاتی ہے

عرصۂ رزم میں ہو جاتا ہے محشر برپا

گرتے ہیں شانوں سے ہو ہو کے جدا سر برپا

برقِ خاطف سرِ میدانِ دمِ تُرش ہی تو آفتِ گرمیِ ہنگامۂ سازش ہے تو

عرصۂ رزم میں پرکالۂ آتش ہے تو آنکھ کیا ٹھہرے کہ صد مایۂ تابش ہے تو

جب کبھی رن میں چمکتی ہوئی تو نکلی ہے

خوف سے ہو کے فنا جانِ عدو نکلی ہے

تو گلے ملتے ہی پیغامِ اجل دیتی ہے شاخِ ہستی کو قلم کر کے یہ پھل دیتی ہے
دم زدن میں سرِ بدخواہ کچل دیتی ہے آن میں نقشۂ پیکار بدل دیتی ہے

فیصلہ کرتی ہے دو ٹوک وہ بے لاگ ہی تو
خشک و تر سب کے جلانے کیلئے آگ ہے تو

آج سے کیا ہے سلف سے ترا سکہ ہے رواں ثبت ہیں لوحِ جہاں پر تری ضربوں کے نشاں
تا بامروز فسانے ہیں ترے وردِ زباں سرخیٔ خوں سے تاریخ ہے زیبِ عنواں

لوہا مانے ہوئے بیٹھا ہے زمانہ تیرا
کہ لبِ زخم پر اب تک ہے فسانہ تیرا

منظومہ جولائی ۱۹۱۸ء

برطانیہ کا جنگی بیڑا

تو وہ بیڑا ہے ترا راج ہے صدیوں سے پانی پر تو وہ بیڑا ہے ناز انگلینڈ کو ہے پاسبانی پر
تو وہ بیڑا ہے جو سرعت میں یکتا ہے گرانی پر تو وہ بیڑا ہے صدقے بحر ہے تیری روانی پر

بنیں ندِّ مقابل کیا ترے سائے سے ڈرتے ہیں
ترے اعدا کے بیڑے تیرے آگے پانی بھرتے ہیں

تو وہ ہے دولتِ برطانیہ کی تجھ سے عظمت ہے
زمانہ مانتا ہے جسکا لوہا تو وہ طاقت ہے

ترے پرچم کے سائے میں ترقی پر تجارت ہے
ترا سکہ رواں ہے جا بجا تیری حکومت ہے

تری دُنیا کے سارے پانیوں پر ڈاک بیٹھی ہے
ظفر یابی کی تیری مُلکوں مُلکوں دھاک بیٹھی ہے

کوئی جھیلے ترے حملے کی ٹکر ہو نہیں سکتا
تلاطُم بحر کا بھی تجھ سے بڑھکر ہو نہیں سکتا

کھُلے پانی میں تیرا کوئی ہمسر ہو نہیں سکتا
اُڑے پانی اگر تجھ سے کوئی در ہو نہیں سکتا

چُھپا جرمن کا بیڑا تیرے ڈر سے کیل میں جا کر
حیا سے اوڑھ لی پانی کی چادر جھیل میں جا کر

نکلتے ہیں جو گولے تیری توپوں کے دہانوں سے
تو بارش آگ کی ہوتی ہے پیہم آسمانوں سے

حریفِ جنگجو دھو بیٹھتے ہیں ہاتھ جانوں سے
اماں ملتی نہیں پانی میں بھی تیرے نشانوں سے

ترے جنگی کروزر آگ پانی میں لگاتے ہیں
دھوئیں دم بھر میں یہ دشمن کے بیڑے کے اُڑاتے ہیں

تری زد میں کوئی آئے تو کب بچکر نکلتا ہے
ترے رستے سے سیلابِ فنا بھی ہٹ کے چلتا ہے

تری توپوں کے منھ سے آگ کا چشمہ اُبلتا ہے گرج سے تیرے گولوں کی زمیں کا دل دہلتا ہے

تری ہیبت سے ہے خود حلقہ گرداب چکر میں

کہ موجیں مارتا ہے بے غل و غش تو سمندر میں

منظومہ ۲۸ مئی ۱۹۱۷ء

پیام شوق

(ایک غریب الوطن کا امریکہ سے پیام ہندوستان کے نام)

ڈوبنے والے ستارے اے لبِ بام آفتاب سرزمینِ ہند میں تجھ کو ہے تو باریاب

جب وہاں چمکے اُفق میں زیرِ دامانِ سحاب میری جانب سے وطن کو اس طرح کرنا خطاب

اک مسافر کو زمیں بوسی کا تیری ذوق ہے

دُور اُفتادہ ترا چشمِ سراپا شوق ہے

اُس کی حسرت ہے کہ جتنے آنکھ سے آنسو گریں جذبِ صادق کے اثر سے سب دُرِ شبنم بنیں

تیرے ساحل تک اُنہیں موجیں صبا کی لے اُڑیں گوہرِ نایاب تجھ پر وار کر صدقے کریں

قطرہ ہائے اشکِ حسرت ملکے تیری خاک میں
بیل بُوٹے بنکے نکلیں سرزمینِ پاک میں

لاکھ وہ گُم کردہ منزل تجھسے کوسوں دُور ہے تیرا دلدادہ ہے، تیرا عاشقِ مہجور ہے
اُسکا قلبِ زار تیری یاد سے معمور ہے راتدن صہبائے اُلفت کے نشے میں چُور ہے

تجھکو رکھتا ہے تصوّر میں ہمیشہ دل کے پاس
حسرتیں ہیں اُسکی آوارہ ترے ساحل کے پاس

اُس کے ارمانوں کی دنیا کعبۂ ایماں ہے تو راحتِ قلبِ طپاں، صبرِ دلِ شکیب جاں ہے تو
ظلمتِ شامِ غریباں میں مہِ رخشاں ہے تو مایۂ تسکین، فروغِ دیدۂ حیراں ہے تو

ہیں جو دامانِ تصوّر میں ترے گلشن کے پھول
سونگھ لیتا ہے انہیں ہوتی ہے جب خاطر ملول

وہ سمجھتا ہے تجھے فردوس بر روئے زمیں بوستانِ بے خزاں، غیرت دہِ چرخِ بریں
تو بساطِ شش جہت پر ہے وہ نقشِ دلنشیں جسپہ نازاں ہے ازل سے صنعتِ حُسن آفریں

پُرضیا اتنے ہیں ذرّے تیری خاکِ پاک کے
ماند ہیں جن سے ستارے گنبدِ افلاک کے

گلشنِ فردوس ہیں تیرے چمن اُس کے لیئے کوثر و تسنیم ہیں گنگ و جمن اُس کے لیئے

طوطیائے چشم ہے خاکِ وطن اُس کیلئے ہے نئی دُنیا تری بزمِ کہن اُس کے لئے

انتخابِ دو جہاں اُس کی نگاہ ہو نہیں ہے تو

نازشِ کون و مکاں اسکی نگاہ ہو نہیں ہے تو

عندلیبِ زار کو جیسے چمن کی آرزو کبک کو جیسے مہِ جلوہ فگن کی آرزو

جیسے پروانہ کو شمعِ انجمن کی آرزو اِس طرح ہے اُس مسافر کو وطن کی آرزو

یاد سے تیری وہ سرگرمِ طپش غربت میں ہے

قلبِ مضطر وقفِ ایذائے خلش غربت میں ہے

دورِ دورے ہونگے جب یوں گردشِ افلاک کے حوصلے نکلیں گے تب اُسکے دلِ غمناک کے

جب پریشاں ہو کے ذرّے اسکی مُشتِ خاک کے ہونگے پیوندِ زمیں تیری بلادِ پاک کے

جلوۂ گُل سے ہویدا ہو گی اک تازہ بہار

کشتۂ سوزِ وطن کی جو رہے گی یادگار

منظومہ مارچ ۱۹۱۳ء

سبزۂ بیگانہ

او مستِ ناز! روند نہ زیرِ قدم مجھے ظالم! بنا نہ تختۂ مشقِ ستم مجھے
ٹھنڈی ہوا میں لینے دے بیدردم مجھے اتنا نہ کر اسیرِ عذابِ الم مجھے
ٹھکرا نہ اس طرح کہ گیاہِ حزیں ہوں میں
خود فرطِ انکسار سے فرشِ زمیں ہوں میں

محوِ خرامِ ناز! قدم رکھ سنبھال کر اُفتادگانِ خاک کا بھی کچھ خیال کر
ناچیز کاہ ہوں میں ذرا دیکھ بھال کر صدقہ شباب کا نہ مجھے پائمال کر
میرے لیئے ہیں آفتِ جاں شوخیاں تری
ڈھاتی ہیں مجھ پہ قہر یہ اٹکھیلیاں تری

مجھ زار و ناتواں پہ گراں بار تو نہ ہو میں خستہ جاں ہوں درپئے آزار تو نہ ہو
پامال ہوں میں اور خبردار تو نہ ہو اتنا بھی محوِ شوخیِ رفتار تو نہ ہو
مجھ پر ستم نہ ڈھائیں یہ انداز چال کے
مستِ مئے شباب ذرا دیکھ بھال کے

اٹھلا کے چل نہ او ستم ایجاد اخیر ہے مجھ خانماں خراب کا کیا تجھ کو تیر ہے

اچھا یہ شغل ہے ترا اچھی یہ سیر ہے — میرا سرِ نیاز ہے اور تیرا پیر ہے

آیا ہے باغ میں پئے گلگشتِ باغ تو
پژمردگی کا دے نہ مرے دل پہ داغ تو

کیوں پانوں ہیچمدان کے سر پر دراز ہے — بیداد گر ستم کا تجھے کیا مجاز ہے
کس بات پر غرور تجھے کینہ ساز ہے — کیا ہست و بود ہے تری جس پر یہ ناز ہے

ہستی ہی کیا جہان میں تیری بقا کی ہے
تو مُشتِ خاک شکل مجسّم فنا کی ہے

سمجھا ہے تو کہ مجھ کو بقائے دوام ہے — پٹّہ تمام دہر کا میرے ہی نام ہے
لیکن یہ بے خبر ترا سودائے خام ہے — آئی اجل تو آن میں قصّہ تمام ہے

عُقدہ کھلے گا زندگیِ بے ثبات کا
دم بھر میں ٹوٹ جائیگا رشتہ حیات کا

نازاں نہ ہو تو زندگیِ مُستعار پر — تکیہ عبث ہے ہستیِ ناپائدار پر
بارِ گراں گُنہ کا نہ لے جسمِ زار پر — چلنا رہِ عدم میں ہے خنجر کی دھار پر

غافل! جو فکر ہے تجھے اپنے مآل کی
تقلید کر جہان میں میری مثال کی

وابستہ میں نہیں چمنِ روزگار سے ۔ نا آشنا ہوں فکرِ خزان و بہار سے
دلبستگی ہے گُل سے نہ کانٹا ہے خار سے ۔ آئینہ وار صاف ہوں گرد و غبار سے
محوِ جمالِ گُل ہوں نہ شیدائے بُو ہوں میں
باغِ جہاں میں سبزۂ بیگانہ خو ہوں میں

کب یہ خیال تھا تجھے وہم و گمان میں ۔ دو حرف میں نے ڈال دیے تیرے کان میں
پُورا اُترنا چاہے اگر امتحان میں ۔ بیگانہ وار تو بھی بسر کر جہان میں
نیرنگِ روزگار کا شائق نہ ہو کبھی
غافل اسیرِ دامِ علائق نہ ہو کبھی

ہرگز ستم نہ توڑ کسی ناتواں پر ۔ بیفائدہ عذاب لے اپنی جان پر
دارِ فنا میں پھول نہ تو عزّ و شان پر ۔ او مُشتِ خاک اُڑ کے نہ چل آسمان پر
ہُشیار ہے تو دہر میں دیوانہ بن کے رہ
باغِ جہان میں سبزۂ بیگانہ بن کے رہ

منظومہ ستمبر ۱۹۰۹ء

شمعِ کُشتہ

رات بھر جلوہ فروزِ محفلِ عشرت رہی   بزم میں تیری تجلّی وجہِ صد زینت رہی
تیری پروانوں سے شب بھر گرمیِ صحبت رہی   دونوں جانب سے بھڑکتی آتشِ اُلفت رہی
کوئی پروانہ جو گر کر ہو گیا فی النّار بھی
تا سحر ٹوٹا نہ تیرے آنسوؤں کا تار بھی

رات بھر تو نے مزے لوٹے ہیں سوز و ساز کے   دیدنی تھے رنگ تیری جلوہ گاہِ ناز کے
تجھ سے سیکھے ڈھنگ پروانوں نے ضبطِ راز کے   حوصلے نکلے بقدرِ ظرف ہر جانباز کے
جو فدا ہونے بڑھا رخسارِ آتشناک پر
گر پڑا آتش بجاں ہو کر بساطِ خاک پر

تیرے دم سے گرمیِ ہنگامۂ محفل ہوئی   تو ضیا بخشِ نظر فرحت فزائے دل ہوئی
پردۂ فانوس میں تو لیلیِ محمل ہوئی   رخ سے جب پردہ ہٹا رشکِ مہِ کامل ہوئی
جوت جاگی جب ترے حسنِ نظر افروز کی
جان میں جان آ گئی پروانۂ جانسوز کی

لَو لگائے تجھ سے ساری رات پروانے رہے   لب پہ جانبازوں کے سوزِ غم کے افسانے رہے

سب شرابِ آتشیں پی پی کے متانے رہے جوش میں آپے سے باہر تیرے دیوانے رہے
شعلہ خوئی پر تری مٹتے رہے سو جان سے
گرد پھر پھر کر ہوئے صدقے ہزار ارمان سے

جان پر کھیلا کیے تفتیدگانِ سوزِ عشق آگ میں گرتے رہے آتش بجانِ سوزِ عشق
دم نہ مارا جل بجھے گو سرگرانِ سوزِ عشق ساتھ اپنے لے گئے رازِ نہانِ سوزِ عشق
جوشِ بیتابانہ آخر کارفرما ہو گیا
درمیاں سے پردۂ بیگانگی وا ہو گیا

عشق نے پیدا کیا رنگِ اثر دونوں طرف سوزشِ الفت نے بھڑکا شعلے دونوں طرف
لاگ کی جب آگ پھیلی تیز تر دونوں طرف کر لیا سوزِ وفا نے دل میں گھر دونوں طرف
سوختہ ساماں جو کوئی خاک جل کر ہو گیا
موم تیرا بھی دلِ مضطر پگھل کر ہو گیا

دونوں جانب سے ہوئے راز و نیازِ حسن و عشق منکشف ہونے لگے سربستہ رازِ حسن و عشق
رنگ لائی لذتِ سوز و گدازِ حسن و عشق ہو گئے یکجان باہم دلنوازِ حسن و عشق
کچھ نہ پروانے کو سوجھا فرطِ غم کے جوش میں
لے لیا تجھ کو تڑپ کر حلقۂ آغوش میں

تا کمر پہنچے جو ڈھلکر گیسوئے لیلائے شب حسن میں تیرے بڑھی شانِ دل افروزی غضب

تجھ سراپا شعلۂ آتش سے ہو کر لب بلب ہو گیا ٹھنڈا دلِ پروانۂ حسرت طلب

چند ساعت وصل میں جب یوں بسر ہونے لگی
آنکھ جھپکاتے شبِ عشرت سحر ہونے لگی

رات بھیگی اوس نے چھینٹے دیئے گلزار پر آ گیا کچھ کچھ عرق تیرے گلِ رخسار پر
پھر گئی زردی سی روئے مطلعِ انوار پر رات بھاری ہو گئی تیرے دلِ بیمار پر

لاکھ ہاتھوں چھانوں کی اہلِ محفل نے تجھے
خاک کر ڈالا جلا کر سوزشِ دل نے تجھے

پڑ گیا پھیکا فروغِ حسنِ لاثانی ترا ملگجا سا ہو گیا ملبوسِ نورانی ترا
چھا گیا محفل میں دودِ سوزِ پنہانی ترا ڈھل گیا سائے کی صورت نورِ پیشانی ترا

دستِ حسرت تیری حالت پر ملے گلگیر نے
رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑا حسن کی تنویر نے

پردۂ شب اٹھ گیا، کھلنے لگے اسرارِ صبح ہو گئی تو سرد پیشِ گرمیِ بازارِ صبح
عالمِ بالا پہ چمکا مطلعِ انوارِ صبح تیرگی رخصت ہوئی ظاہر ہوئے آثارِ صبح

چرخ پر ڈوبے ستارے چاندنی پھیکی ہوئی
بڑھ چلا نورِ سحر کافور تاریکی ہوئی

ضو فشاں جب جلوۂ رنگِ شفق ہونے لگا — خاکدانِ دہر کا روشن طبق ہونے لگا
تیرے روئے آتشیں کا رنگ فق ہونے لگا — عارضِ رنگیں ترا سادہ ورق ہونے لگا
ہستیِ بے بُود آخر دے گئی دھوکا تجھے
کر گیا ٹھنڈا نسیمِ صبح کا جھونکا تجھے

تیرے گُل ہوتے ہی قصہ مختصر کچھ بھی نہ تھا — خواب کا نقشہ تھا سب رنگِ اثر کچھ بھی نہ تھا
کھُل گیا جز بے ثباتی جلوہ گر کچھ بھی نہ تھا — رات بھر کی ساری رونق تھی سحر کچھ بھی نہ تھا
شمعِ کُشتہ! تو مجسم یاس کی تصویر ہے
یا بیاضِ صُبحِ پر اندوہ کی تفسیر ہے

منظومہ ستمبر سنہ ۱۹۱۲ء

دلِ درد آشنا

جسے راہِ طلب میں کھیل ہو اپنا مٹا دینا — ہمیشہ جس کی خو ہو جل کے بھی بُوئے وفا دینا
جسے آتا ہو جورِ ناروا سہہ کر دُعا دینا — ودیعت جس کی فطرت میں ہو روتوں کو ہنسا دینا
مرے پہلو میں یارب وہ دلِ درد آشنا دینا

کمر بستہ رہے جو ہر نفس امدادِ بیکس پر — ہمیشہ گوش بر آواز ہو فریادِ بیکس پر

جو اشکِ خوں بہائے خاطرِ ناشادِ بیکس پر تڑپ اٹھے جو دردانگیزیٔ فریادِ بیکس پر

مرے پہلو میں یارب وہ دلِ دردآشنا دینا

جسے گرمِ طپش رکھے تڑپنا بیقراروں کا نہ دیکھا جائے جس سے حالِ زار آفت کے ماروں کا

جسے بیتاب کر دے شورِ ماتم سوگواروں کا جو انگاروں پہ لوٹے سن کے نالہ دلفگاروں کا

مرے پہلو میں یارب وہ دلِ دردآشنا دینا

اثر انداز ہوں جس پر نہ یہ جذباتِ نفسانی جو مثلِ آئینہ ہو پرتوِ وحدت سے نورانی

خیال و خواب میں جس کو نہ ہو فکرِ تن آسانی جو سمجھے دلنوازی مدعائے جسمِ انسانی

مرے پہلو میں یارب وہ دلِ دردآشنا دینا

صدائے نالۂ غم پر جو ہاتھوں سے نکل جائے مدد کو غمزدوں کی مرتے مرتے بھی سنبھل جائے

جو سوزِ آہِ آتشبارِ بیکس سے پگھل جائے پرائی آگ میں جو صورتِ پروانہ جل جائے

مرے پہلو میں یارب وہ دلِ دردآشنا دینا

جو ہمدردی رکھے حسرت زدہ محتاج بندوں سے کرے جو پرسشِ سوزِ نہانی دردمندوں سے

نہ رکھے کام جز رسمِ وفا دنیا کے دھندوں سے اسیرانِ بلا کو جو چھڑا لے غم کے پھندوں سے

مرے پہلو میں یارب وہ دلِ دردآشنا دینا

جو آنکھیں نم پئے افتادگانِ خاک رکھتا ہو گرانجانوں کے ماتم میں گریباں چاک رکھتا ہو

اشاروں سے سمجھ لے حالِ دل ادراک رکھتا ہو　　جسے بیچین دردِ خاطرِ غمناک رکھتا ہو

مرے پہلو میں یارب وہ دلِ دردآشنا دینا

جسے اُلجھن میں ڈالے زلفِ جاناں کی پریشانی　　بنادے نقشِ حیرت جس کو آئینے کی حیرانی
گریباں چاک کر دے جسکا گُل کی چاک دامانی　　جو آتش زیرِ پا ہو دیکھکر شعلے کی عُریانی

مرے پہلو میں یارب وہ دلِ دردآشنا دینا

نہ لائے تاب جو مظلوم کے دلدوز نالوں کی　　شعارِ خاص ہو جسکا مدد آشفتہ حالوں کی
جسے مدِّ نظر ہو قدردانی بے کمالوں کی　　کرے سو جان سے جو دستگیری پائمالوں کی

مرے پہلو میں یارب وہ دلِ دردآشنا دینا

جو خدماتِ خلائق اپنا فرضِ منصبی سمجھے　　شریکِ درد و غم ہونا طریقِ راستی سمجھے
یتیموں کی مدد کرنے میں اپنی بہتری سمجھے　　جو بیکس پروری پہلا اُصولِ زندگی سمجھے

مرے پہلو میں یارب وہ دلِ دردآشنا دینا

جو چارہ سازیِ زخمِ نہاں بے مدّعا کر دے　　تصدّق بیکسوں پر اپنی جانِ مبتلا کر دے
جو کارِ خیر کرکے نقشِ داماں فنا کر دے　　جو نیکی کرکے بھولے قطعِ اُمیدِ وفا کر دے

مرے پہلو میں یارب وہ دلِ دردآشنا دینا

منظومہ جون ۱۹۱۲ء

کارِ خیر

"یہ مصنّف کی سب سے پہلی نظم ہے جو جنوری سنہ ۱۹۱۰ء میں رسالہ زبان دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم نہایت پسند کی گئی متعدد مرتبہ پمفلٹوں کی شکل میں شائع ہو چکی ہے اور آج تک مقبولِ عام ہے۔"

بتا اے خاک کے پتلے کہ دنیا میں کیا کیا ہے   بتا کہ دانت ہیں منہ میں ترے کھایا پیا کیا ہے
بتا خیرات کیا کی راہِ مولا میں دیا کیا ہے   یہاں سے عاقبت کے واسطے توشہ لیا کیا ہے

دعائیں لیں کبھی ٹھنڈا کیا دل تشنہ جانوں کا
ہوا ہے تو کبھی راحت رساں تشنہ دہانوں کا

کسی گم کردہ رہ کی خضر بنکر رہنمائی کی   کسی کی ناخنِ تدبیر سے عقدہ کشائی کی
دمِ مشکل کسی مظلوم کی حاجت روائی کی   کسی کی دستگیری کی کسی سے کچھ بھلائی کی

کبھی کچھ کام بھی آیا کسی آفت رسیدہ کے
کبھی دامن سے پونچھے تو نے آنسو آبدیدہ کے

شریکِ دردِ دل ہو کر کسی کا دکھ بٹایا ہے   مصیبت میں کسی آفت زدہ کے کام آیا ہے
پرائی آگ میں پڑ کر کبھی دل بھی جلایا ہے   کسی بیکس کی خاطر جان پر صدمہ اٹھایا ہے

کبھی آنسو بہائے ہیں کسی کی بدنصیبی پر
کبھی دل تیرا بھر آیا ہے مفلس کی غریبی پر

کسی کا عقدۂ مشکل کبھی آساں کیا تو نے   کسی درماں طلب کے درد کا درماں کیا تو نے

کسی دلگیر کا دل غنچہ خنداں کیا تو نے　　کسی کو بھی کبھی شرمندہ احساں کیا تو نے

کسی درماندہ منزل کے سر سے بوجھ اُتارا ہے

بسا طِ دردمندی پر کسی سے قول ہارا ہے

کبھی تو نے کسی برگشتہ قسمت کی خبر لی ہے　　کسی ماتم زدہ کی تو نے دلجوئی کبھی کی ہے

کسی کے واسطے آفت میں اپنی جان ڈالی ہے　　کسی بے خانماں کو وقتِ مشکل کچھ مدد دی ہے

ہجوم یاس میں ہمت بڑھائی دل شکستہ کی

کبھی کچھ چارہ فرمائی بھی کی زخمی و خستہ کی

کبھی امداد دی تو نے کسی بیکس بچارے کو　　سخی بنکر دیا کچھ تو نے مفلس کے گزارے کو

تسلی دی کبھی تو نے کسی آفت کے مارے کو　　کبھی تو نے سہارا بھی دیا ہے بے سہارے کو

کبھی فریاد رس بنکر خبر لی بے نواؤں کی

لگی ہے چوٹ بھی دل پر صدا سنکر گداؤں کی

کسی برگشتہ قسمت بے نوا کی دلنوازی کی　　کسی کے خندہ زخم جگر کی چارہ سازی کی

کسی کے واسطے غم میں گھلا کیا جانگدازی کی　　اگر تھا صاحبِ توفیق کیا بندہ نوازی کی

سنا کب کان دھر کر نالۂ غم بے نواؤں کا

ہمیشہ والہ و شیدا رہا اپنی اداؤں کا

رہا تو را تدن مصروفِ شغلِ مے پرستی میں   گنوائی رائگاں عمرِ دو روزہ کیفِ مستی میں
تلا پھولوں میں گلچھرّے اُڑائے باغِ ہستی میں   رہا غرقِ نشاط و عیش ہو کر قعرِ پستی میں

رہا پیے رنگ لوٹے تو نے خوب پی پی کر مئے احمر
شبِ مہتاب میں جلسے رہے ہیں ماہتابی پر

رہا محوِ تماشا حُسن کا، انداز کا شیدا   رہا تو جان سے تو ہر ادائے ناز کا شیدا
رہا عشرت کا خواہشمند حرص و آز کا شیدا   رہا دولت کا دلدادہ، رہا اعزاز کا شیدا

سدا نازاں رہا آرائشوں پر جامہ زیبی پر
بہت نازاں رہا اپنی ادائے دلفریبی پر

بہت تو نے بہارِ زندگانی کے مزے لوٹے   بہت زیرِ قدم تو نے کیے پامال گُل بوٹے
بہت جامِ مئے گلرنگ تیرے ہاتھ سے ٹوٹے   بہت لالہ رُخوں کے لعلِ لب تو نے کیے جھوٹے

رہا تو بے غل و غش محوِ شغلِ عیش کوشی میں
کبھی فکرِ مآل آیا نہ ذوقِ خود فروشی میں

کیا ہے خُم غلط برسوں ربابِ چنگ سے تو نے   مزے لوٹے کیا دل شاد کس کس ڈھنگ سے تو نے
سُنے دلسوز نغمے سازِ خوش آہنگ سے تو نے   بجھائی تشنہ کامی آبِ آتش رنگ سے تو نے

نہ چھوڑا پر نہ چھوڑا تو نے شغلِ جام و مینا کو
ستم ہے بے نوا ترسا کیے نانِ شبینہ کو

مرقعِ عسرت و عشرت کا یہ نیرنگِ عالم ہے کہیں ہے نغمۂ شادی کہیں جا شورِ ماتم ہے
کوئی خنداں کوئی شاداں کوئی با دیدۂ نم ہے دو رنگی ہے تماشے کی کہیں شادی کہیں غم ہے
خزاں کا دور دورہ ہے کبھی فصلِ بہاری ہے
کبھی ہیں وصل کی راتیں کبھی اختر شماری ہے
ذرا تو سوچ لے غافل! رہیگا شادماں کبتک کریگا خون اپنے وقت کا نا قدرداں کبتک
ترے باغِ جوانی میں نہ آئیگی خزاں کبتک رہیگا تیری قسمت سے موافق آسماں کبتک
رہیگا تا بہ کے مصروف دنیا کے جھمیلے میں
کہاں تک کھوئیگا عمرِ رواں پانی کے ریلے میں
مسرت پہ ہو نازاں دو روزہ ہی خوشی تیری سرشکِ خوں رلائیگی یہ دم بھر کی ہنسی تیری
عبث ہی ہستیٔ موہوم سے دلبستگی تیری رہینِ پنجۂ دستِ اجل ہے زندگی تیری
غضب ہے بیکسی پر اس قدر اندازِ مستانہ
چھلک جائیگا ہو کر عمر کا لبریز پیمانہ
فنا و زیست کا اک روز قصہ پاک ہونا ہے اجل کے ہاتھ سے دامانِ ہستی چاک ہونا ہے
کسی دن خاک کا تودہ تہہِ افلاک ہونا ہے کہ آخر خاک کے پتلے کو مشتِ خاک ہونا ہے
حباب آسا قرارِ زیست ہے دنیائے فانی میں
جو تجھ سے ہو سکے کر لے بھلائی زندگانی میں

نظارہ چشمِ معنی خیز سے کر باغِ امکاں کا سبق آموز ہے ایک ایک ذرہ اِس گلستاں کا
نہ ہو محوِ تماشا ہوش رکھ اپنے تن و جاں کا اُلجھنے پائے کانٹوں میں نہ گوشہ تیرے داماں کا

بسر کر زندگی قیدِ تعلّق سے جدا ہو کر
برنگِ سبزۂ بیگانہ رہ نا آشنا ہو کر

نہ پھول اتنا زر و دولت پہ تو گلزارِ ہستی میں کہیں اس سربلندی کی نہو اُفتاد پستی میں
سنبھل اتنا نہ بڑھکر چل ذرا راہِ ہستی میں خدا کا خوف بھی رکھ دل میں جوشِ کیفِ مستی میں

نظر کر ایک مُشتِ خاک ہے کیا تیری ہستی ہے
رہینِ گردشِ افلاک ہے کیا تیری ہستی ہے

نہ دولت ساتھ جائیگی نہ حشمت ساتھ جائیگی نہ شوکت ساتھ جائیگی نہ رفعت ساتھ جائیگی
پسِ مُردن نہ یہ شانِ امارت ساتھ جائیگی نہ عظمت ساتھ جائیگی نہ صولت ساتھ جائیگی

جو پُوچھے جائینگے محشر میں وہ اعمال ہیں تیرے
اگر کچھ ساتھ جائینگے تو وہ افعال ہیں تیرے

مناسب ہے کہ نیک افعال کر طاعت گزاری کر پسندیدہ طریقے سیکھ عجز و انکساری کر
بھلائی کر۔ بدی سے باز آ۔ پرہیزگاری کر جہانتک ہو سکے تو خلق کی خدمتگزاری کر

اگر نیکی کریگا تو خدا اس کا ثمر دے گا
ترا دامن بھی اُمّید کے پھولوں سے بھر دے گا

منظومہ جنوری ۱۹۰۸ء

راضی بہ رضا

شکوہ نہ بیش و کم کا، غم کا نہ کچھ گلا ہے — جس چیز کے تھے قابل، ملنا تھا جو ملا ہے
شانِ کرم سے قائم ہستی کا سلسلہ ہے — شکرِ کریم دل کے آئینہ کی جِلا ہے
راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تری رضا ہے

جو نعمتیں ملی ہیں وہ کم ہیں یا ہیں وافر — ہر حال میں ہے لازم تقدیر پر ہوں شاکر
رنگِ ظہورِ قُدرت ہر ذرّے سے ہے ظاہر — اوّل بھی تو ہے برحق، مالک تو ہی آخر
راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تری رضا ہے

فیضِ عمیم تیرا دنیا میں چار سُو ہے — تاروں میں نُور تیرا، پھولوں میں تیری بُو ہے
سر بہرِ شکرِ نعمت خم تیرے روبرو ہے — پُتلے ہیں ہم خطا کے، بندہ نواز تُو ہے
راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تری رضا ہے

جس حال میں رکھے تو داتا ہمیں ہے رہنا — پھُولوں میں یا ہو تُلنا، یا درد و رنج سہنا
پہنے ہے سر سے پا تک ملبوسِ شُکر پہنا — دل میں یہی تمنّا مُنھ سے یہی ہے کہنا
راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تری رضا ہے

حاصل ہو سربلندی یا ہو نصیب پستی — دورِ مئے طرب ہو، یا عہدِ فاقہ مستی

ہو عیش و شادمانی یا رنج و تنگدستی   تسلیم اپنا شیوہ، مسلک ہے حق پرستی

راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تری رضا ہے

سازِ حیات کیا ہے سامان ہے یہ تیرا   جو اہلِ زندگی ہے عرفان ہے یہ تیرا
سرچشمۂ کرم تو، فیضان ہے یہ تیرا   بخشی ہیں نعمتیں جو احسان ہے یہ تیرا

راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تری رضا ہے

خوانِ کرم پہ تیرے مہمان ہے زمانہ   ملتا ہے رزق بنکر قسمت کا دانہ دانہ
جُود و سخا کا مخزن ہے تیرا آستانہ   کیوں برقؔ کے ہو لب پر ہر دم نہ یہ ترانہ

راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تری رضا ہے

منظومہ مارچ ۱۹۲۲ء

ہمہ اوست

وہی شعلۂ سرِ طُور ہے، وہی برقِ حُسنِ نگار ہے
وہی ایک جلوۂ یار ہے، وہی نُور ہے وہی نار ہے
وہی جلوہ ریزِ حرم میں ہے، وہی نُورِ بیتِ صنم میں ہے
وہی تم میں ہے، وہی ہم میں ہے، وہی سب کا دار و مدار ہے

وہی رندِ جام بدست ہے، وہی مستِ روزِ الست ہے
وہی کیفِ بادۂ ہست ہے، وہی اس نشے کا خمار ہے

وہی ضو فروزِ حیات ہے، وہی عکس ریزِ صفات ہے
وہی نورِ جلوۂ ذات ہے، وہی ایک برسرِ کار ہے

وہی جلوہ ہے، وہی جلوہ گر، وہی خود نما وہی خود نگر
وہی حسنِ ناز فروش ہے، وہی رخ پر اپنے نثار ہے

وہی حسن ہے، وہی عشق ہے، وہی ہے صفا وہی صدق ہے
وہی تاب بخشِ جمالِ گل، وہی روحِ صوتِ ہزار ہے

وہی ہے فنا، وہی ہے بقا، وہی ابتدا، وہی انتہا
وہی جزو میں ہے، وہی کل میں ہے، وہی اصل و آخرِ کار ہے

وہی مہر ہے وہی ماہ ہے، وہی برقِ چشمِ سیاہ ہے
وہی تابِ شعلۂ آہ ہے، وہی حسنِ روئے شرار ہے

منظومہ جون ۱۹۲۲ء

روشنیِ علم

میہماں دن بھر ہے خورشیدِ سحر کی روشنی — شام سے تا صبح ہے نورِ قمر کی روشنی
چار دن ہے جلوہ حسنِ بشر کی روشنی — ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے دنیا میں زر کی روشنی
ہے مگر اوّل سے تا آخر ہنر کی روشنی
روشنیِ علم ہے آٹھوں پہر کی روشنی

اس کے پرتو سے سیاہی جہل کی کافور ہے — ہے یہی وہ نور سا جس سے کوسوں دور ہے
دیکھ لی جس نے جھلک اس کی وہی مسرور ہے — کورِ مادرزاد کی آنکھوں میں اس سے نور ہے
مشتِ خاکِ انساں کا بھی بول بالا اس سے ہے
خاکدانِ دہر میں ہر سو اجالا اس سے ہے

ہے یہی وہ روشنی جو ہے ضیا بخشِ نظر — کاشفِ اسرار ہے جس کی تجلّی کا اثر
پردہ ہائے راز اٹھ جاتے ہیں جس سے سر بسر — حسنِ اصلی میں نظر آتی ہے ہر شے جلوہ گر
تیرگی جہل یوں مٹتی ہے اسکے نام سے
بھاگتی ہے جس طرح ظلمت چراغِ شام سے

گر خدا یہ روشنی عالم میں پھیلاتا نہیں — پھر کھلی آنکھوں بھی کچھ ہمکو نظر آتا نہیں

خاک کا پُتلا یہ اعلیٰ مرتبہ پاتا نہیں — اشرف المخلوق یہ دُنیا میں کہلاتا نہیں
ہوتے دنیا کے تماشے تو بشر کے سامنے
ایک پردہ سا پڑا رہتا نظر کے سامنے
روشنیٔ علم سے چودہ طبق روشن ہوئے — دفترِ اسرار کے دُھندلے ورق روشن ہوئے
درسگاہِ بزمِ امکاں کے سبق روشن ہوئے — کھل گئیں آنکھیں سبھی مضمونِ ادق روشن ہوئے
چار چاند اس کی ضیا سے لگ گئے انسان کو
روشنیٔ علم سے دیکھا خدا کی شان کو

منظومہ مارچ ۱۹۱۷ء

بہار بسنت

موسم بسنت کا بھی کتنا طرب فزا ہے — فرحت دہِ دل و جاں ہر جنبشِ صبا ہے
کشت و چمن کا منظر دلچسپ و دلکشا ہے — جنگل کے بیل بوٹوں میں خوشنما ادا ہے
سرسوں کے کھیت کیا ہیں کیسر کی کیاریاں ہیں
قُدرت کی خاک پر یہ زیبا نگاریاں ہیں
انگڑائی لیکے سبزہ گلشن میں لہلہایا — صحرا میں ڈھاک پھولا ابر آسماں پہ چھایا

گیندا کِھلا چمن میں آموں پہ بُور آیا کویل کے زمزموں نے مژدہ نیا سُنایا

معصوم مُسکراہٹ غنچوں کے لب پہ آئی

اے عندلیبِ نالاں! اُمید دل پہ آئی

مہکی ہوئی ہیں کلیاں، پھیلا ہے عطر افشاں خوشبو سے ہے معطّر بادِ صبا کا داماں

بھونرے ہیں مست ہو کر پھولوں کے گرد رقصاں رنگین تتلیاں ہیں پروانہ وار قُرباں

چھایا ہوا ہے سب پر خُود رفتگی کا عالم

احساسِ تازگی سے ہے سرخوشی کا عالم

رُخ سے عروسِ گُل نے اُلٹی نقابِ رنگیں صدقے اُتر رہی ہے شانِ ادائے تمکیں

کانٹوں نے نوک کی لی پھر بہرِ دستِ گُلچیں آمد بہار کی ہے بدلا ہے رنگِ تزئیں

گُلہائے اشرفی کا سکّہ چلا چمن میں

شبنم نے ہر کلی کے موتی بھرے دہن میں

یخ بستہ ندیاں اب اٹھلا کے چل رہی ہیں وارفتہ بُلبلے ہیں لہریں مچل رہی ہیں

بیتاب مچھلیاں ہیں کیسی اُچھل رہی ہیں موجوں کے ساتھ یہ بھی پہلو بدل رہی ہیں

کِھل کر کنول ادائے دلکش دکھا رہے ہیں

آبِ رواں پہ اپنا نقشہ جما رہے ہیں

دنیا شگفتگی سے معمور ہو رہی ہے　　پژمردگی دلوں سے کافور ہو رہی ہے
ہر آنکھ دیدِ گُل سے مخمور ہو رہی ہے　　کیا جوش ہے طبیعت مسرور ہو رہی ہے
فطرت نے ساز و سامان تفریح کا کیا ہے
گویا بہارِ نو کا مژدہ ہمیں دیا ہے

خوابِ گراں سے چونکو بھارت کے نونہالو　　ہیں تازہ دم شجر تک ہوش اپنے تم سنبھالو
مُردہ دلی کو چھوڑو، گھر سے قدم نکالو　　قومیں جو بڑھ چلی ہیں رستے ہیں ان کو جالو
منزل پہ سب سے پہلے پہنچے قدم تمہارا
مقصود سامنے ہے ٹوٹے نہ دم تمہارا

منظومہ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

پدمنی کا جوہر

علاؤالدین چڑھا چتوڑ پر جب لاؤ لشکر سے　　اُدھر سے راجپوت آئے کفن باندھے ہوئے سر سے
پرا باندھے ہوئے یوں دونوں جانب سے نبرد آرا　　برسنے کو گھٹائیں جس طرح اٹھتی ہیں اُتر سے
ہوئے سینہ سپر جانباز دو دو ہاتھ کرنے کو　　کھنچی تیغِ دو دم، چلنے لگیں چوٹیں برابر سے
دم پیکار دی دادِ شجاعت سرفروشوں نے　　بجھائی تشنہ کامی شہادت آب خنجر سے

شجاعانِ وغا پرور نہائے خون میں اپنے
شہیدوں کو ملا خونیں کفن زخموں کی چادر سے

شفق گوں ہو گیا سیلابِ خوں سے دامنِ صحرا
لگے کُشتوں کے پُشتے کاسۂ سر اس قدر برسے

زمیں تھرّا گئی دل ہل گئے شیروں کے سینوں میں
وہ ہنگامہ ہوا جو کم نہ تھا آشوبِ محشر سے

دکھائے ہاتھ ایسے راجپوتوں کے سپوتوں نے
صدائے الاماں کا شور اُٹھا دشمن کے لشکر سے

گرے سینہ سپر قلبِ عدو پر برچھیاں تانے
اُلٹ ڈالیں صفیں ٹکرا گئے سدِّ سکندر سے

پھرا مُنہ نوک سے برچھی کی تیغِ اصفہانی کا
روانی چھین لی کھانڈے نے شمشیرِ دو پیکر سے

قدم اُکھڑے ہٹی کھاتے ہی گھونگٹ فوجِ سُلطانی
مگر پھر جی کیا پلٹی پرے باندھے نئے سر سے

بھلا کیا پیش جا سکتی تھی گنتی کے جوانوں کی
کہ تھا صف افگنوں کا سامنا لشکر کے لشکر سے

کریں کیا کھا یہ دل میں ٹھان لی بانکے دلیروں نے
ہتھیلی پر رکھا سر ہاتھ دھو کر جانِ مُضطر سے

لباسِ زعفرانی زیبِ تن کر کے قسم کھائی
دھنی ہیں تیغ کے سر دیکے ٹالینگے بلا سر سے

چُھپایا مُنہ جو خورشیدِ فلک نے خونیں منظر سے
محل میں بھیمسی آیا جُدا ہوتے ہی لشکر سے

بُلایا پدمنی کو الوداعِ آخری کہنے
کہ تھی شامِ جُدائی کی گھڑی اُس ماہ پیکر سے

نظر ملتے ہی باہم نقشِ حیرت بن گئے دونوں
ہوا سکتے کا عالم رہ گئے حیران و ششدر سے

نگاہِ یاس سے رانا نے دیکھا ماہِ خوبی کو
برستی تھی اُداسی دل کی غم آلود تیور سے

نہ نکلا حرف منھ سے ترجمانِ غم بنیں نظریں
بندھا تار آنسوؤں کا دونوں جانب دیدۂ تر سے

ادا دانی سے توڑی پدمنی نے مُہرِ خاموشی
عیاں تھے جوہرِ عصمت شعاری رُوئے انور سے

ہوئی یوں سر جھکا کر دست بستہ محوِ گویائی
"یہ پُرمعنی نگاہیں کم نہیں ہیں تیر و نشتر سے

تاسّف ہے عبث ہوگا وہی جو ہو کے رہنا ہے
نہیں چلتی کسی کی پیش برگشتہ مقدّر سے

اگر ساکھا کرینگے جان دے کر سُورما نہیں
چتا میں بیٹھکر میں جل مرونگی رسمِ جوہر سے

بلا سے آنچ آئے جان پر پروا نہیں اسکی
ستی ہو جاؤنگی ہوکر تصدّق آپکے سر سے

بجائے شرق نکلے غرب سے سُورج یہ ممکن ہے
حیا باہر نہ نکلے گی نگاہِ شرم پرور سے

مجھے آغوشِ مادر ہیں بھڑکتی آگ کے شعلے
نہیں ہے فرشِ انگاروں کا کم پھولوں کے بستر سے

یہ کہتے ہی چتا میں پاؤں رکھا آگ بھڑکائی
عدم کی راہ لی منھ ڈھانک کر شعلوں کی چادر سے

بپئے ناموس جلکر شمع ساں ناپید ہونا تھا
جہاں میں پدمنی کو زندہ جاوید ہونا تھا

منظومہ فروری ۱۹۱۵ء

زیبُ النّسا کی قبر

زیبُ النسا کی قبر جو تھی خاک میں نہاں — صدیوں کے بعد اُسکا ملا گم شدہ نشاں

مشہور ہے جو تیس ہزاری کے نام سے — تھا گنج بے بہا اُسی میدان میں نہاں

مٹی میں مل رہا تھا دُرِ شاہوار حیف — اوجھل نظر سے خاک کے تودوں کے درمیاں

شاید پسِ فنا یہ تخلص کا تھا اثر — مخفی کی قبر بھی جو خفا میں رہی نہاں

اُگلا ہے خود بخود یہ دفینہ زمین نے — ممنونِ جستجو نہیں رُودادِ بیکساں

تصویرِ دستبُردِ حوادث ہے سربسر — اُبھرا ہے فرشِ خاک پہ جو نقشِ رائگاں

گنبد ہے، مقبرہ ہے نہ لوحِ مزار ہے — تعویذِ قبر کا بھی ہے مٹتا ہوا نشاں

نے شمع ہے نہ چادرِ گل ہے نہ قبر پوش — مٹی کا ایک ڈھیر ہے عبرت کی داستاں

ویرانیِ لحد ہے مجاورِ سرِ مزار — زائر ہجومِ یاس تباہی ہے پاسباں

ہے گرد سے اٹا ہوا انبار خاک کا — سبزہ تو کیا کہ شکلِ نمو بھی نہیں عیاں

اُڑتی ہے خاک اور برستی ہے تیرگی — چھایا ہوا ہے حسرت و اندوہ کا سماں

روتی ہے بیکسی سرِ بالیں کھڑی ہوئی — تربت پہ کس مپرسی کا عالم ہے نوحہ خواں

بادِ صبا چڑھاتی ہے چادر غبار کی — ہیں ذرہ ہائے ریگِ بیاباں گہر فشاں

ہے اُسکی خوابگہ شبستانِ خاک اب
زیبندہ جسکے دم سے تھے قصرِ فلک نشاں

جو دُختِ ماہوشِ شہِ ہندوستاں کی تھی
تھا مصدرِ سخا و کرم جس کا آستاں

روشن چراغِ بزمِ سخن جسکے دم سے تھا
مشہور تھی جو شاعرۂ فیض ترجماں

اُس کو پسِ فنا ہے یہ مٹیا محل نصیب
دامن کو جس کے گردِ سرِ راہ تھی گراں

سچ ہے نہیں زمانے کو اک وضع پر قرار
نیرنگیٔ روزگار چُنیں ہے گہے چُناں

برحق کہ بے ثبات ہیں اسبابِ ظاہری
سچ ہے کہ انقلاب کی تصویر ہے جہاں

ہے امتیازِ شاہ و گدا تا بہ زندگی
ہے زیرِ خاک پست بلندیِ عزّ و شاں

وہ آج غرقِ خوں ہیں جو کل محوِ ناز تھے
وہ آج سرنگوں ہیں جو کل سرفراز تھے

(منظومہ فروری سنہ ۱۹۲۱ء)



پریم کا تحفہ

یا

بھیلنی کے بیر

بیتاب تھیں شیوری کی پئے دید نگاہیں   حسرت کش یک جلوۂ خورشید نگاہیں
تھیں مظہر کیفیت اُمّید نگاہیں   یا دفترِ جذبات کی تمہید نگاہیں

تشنہ لبِ نظّارہ بصد ذوق تھیں آنکھیں
وا تھا درِ دل فرشِ رہِ شوق تھیں آنکھیں

تھا وردِ زباں نام شری رام کا ہر دم   ہر تارِ نفس پر تھا یہی نغمۂ پیہم
تھی محو اسی دُھن میں، نہ تھا فکرِ دو عالم   بھگتی کی، عبادت کی تھی تصویرِ مجسّم

تھا قصرِ حیات آرزوئے دید پہ قایم
دُنیا تھی مُرادوں کی اس اُمیّد پہ قایم

اک دن جو دکھائی کششِ شوق نے تاثیر   بر آئی تمنّائے دلی، کُھل گئی تقدیر
آ نکلے اُدھر پریم سے کھچکر شری رگھبیر   ذرّے نے کیا مہرِ جہانتاب کو تسخیر

بے پردہ رُخِ شاہدِ یکتا نظر آیا
حُسنِ نظر افروز کا جلوا نظر آیا

شیوری کو ہوئی دولتِ دیدار میسّر   بیتاب کے ہاتھ آیا قرارِ دلِ مُضطر
چومے قدمِ پاک سرِ عجز جھُکا کر   موتی کیے اشکوں کے عقیدت سے نچھاور

پھر پیش کیے بیر جو چُن چُن کے دھرے تھے
جو قند سے میٹھے تھے لطافت سے بھرے تھے

بھگوان نے اخلاص و مدارات کو دیکھا   وارفتۂ دیدار کے جذبات کو دیکھا
کچھ ذات کو دیکھا نہ کچھ اوقات کو دیکھا   دیکھا تو فقط پریم کی سوغات کو دیکھا

ڈُوبے ہوئے تھے بیر محبت کے جو رس میں
خود پریم کے ساگر بھی ہوئے پریم کے بس میں

ہے رسم محبت کی زمانے سے نرالی   بھگتی کبھی تاثیر سے رہتی نہیں خالی
منظور کیا رام نے یہ تحفۂ عالی   بنیاد جہاں میں پتت اُدّھا کی ڈالی

اے کاش! اچھوتوں کو گلے ہم بھی لگائیں
اس پریم کے افسانے کو آدرش بنائیں

(منظومہ فروری سنہ ۱۹۲۶ء)

راجکُماری پنا

دل میں تھا مان سنگھ سے جو پیکار کا خیال — فیروز شاہ لیکے چلا فوج بے شمار
دیکھا تو اتفاق سے میدان صاف تھا — حاضر تھے گرد و پیش نہ راجہ کے جاں نثار
رنواس میں تھیں کچھ سمن اندام جلوہ گر — کچھ قلعے میں جوان تھے نا آزمودہ کار
راجہ کی زندگی کا بھی دورِ اخیر تھا — کیفِ شباب کا تھا اُترتا ہوا خُمار
وہ ہاتھ جو سُلاتے تھے شیروں کو خاک پر — اب ہو چلے تھے آمدِ پیری سے رعشہ دار
تابِ مقابلہ نہ تھی فوجِ غنیم سے — ناچار قلعہ گیر ہوا شیرِ کارزار
سیلاب وار رَن میں بڑھا لشکرِ حریف — چاروں طرف سے گھیر لیا دامنِ حصار
ناکوں پہ ایستادہ ہوئے دستہ ہائے فوج — محصور تا نہ پائیں کمک نے رہِ فرار
توپوں کے مُنہ سے آگ کا چشمہ اُبل پڑا — دونوں طرف سے دل کا نکلنے لگا بُخار
تیروں کا مینہ برسنے لگا رزمگاہ میں — روئے زمیں لہو سے ہوا رشکِ لالہ زار
کچھ روز خوب معرکہ آرائیاں ہوئیں — کچھ روز ہم نبرد رہے گرمِ کارزار
کچھ پیش اہلِ قلعہ کے آگے نہ چل سکی — دشمن نے جان توڑ کے حملے کیے ہزار
تعداد راجپوتوں کی گھٹنے لگی مگر — لشکر کے سامنے تھا بھلا ان کا کیا شُمار

سامانِ حرب و ضرب بھی دینے لگا جواب — تازہ حریف فاقہ کشی ہو گئی دوچار
دیکھا، ہجومِ یاس کا جمتا ہوا جو رنگ — راجہ نے کشت و خوں کا کیا عزمِ استوار
یہ ٹھان لی کہ قلعہ کا دروازہ کھول کر — جانباز جا پڑیں صفِ دشمن پہ ایکبار
کھانڈوں پہ رکھ لیں قلبِ سپاہِ غنیم کو — سینہ بسینہ ہو کے کریں دل جگر فگار
جوہر کی رسمِ خاص ہو رتوآں میں ادا — ساکھا صفِ عدو میں کریں سورما سوار

آنے نہ پائے حرف شجاعت کی آن پر
رن میں وطن کے نام پہ جانیں کریں نثار

پہنچی خبر یہ راجکماری کے کان تک — برچھی کی اک انی ہوئی قلبِ طپاں کے پار
نقشہ نظر میں پھر گیا میدانِ جنگ کا — تڑپا خیالِ مرگِ پدر سے دلِ فگار
پتلا تھی اپنے نام کی پتلی تھی عقل کی — روئے حسیں سے جوہرِ دانش تھے آشکار
سوچا کہ مٹھی بھر ہیں دلیرانِ سرفروش — بے موت کٹ مرینگے یہ ہنگامِ کارزار
پیش آئیگا نوشتۂ تقدیر تو ضرور — بہتر ہے کارگر کوئی تدبیر کا ہو وار
آتے ہی یہ خیال ہٹی تیرگیِ یاس — اُمید کی جھلک ہوئی ظلمت سے آشکار
نامہ اُمید سنگھ کو فوراً رقم کیا — جس کا تھا حرف حرف اک عنوانِ انتظار
"اے شیر مرد! معرکہ آرائے کارزار — اے صف شکن! دلاورِ یکتا! عدو شکار"

"نرغے میں دشمنوں کے ہیں ہم خستہ جاں اسیر   محصور و مبتلائے الم ہیں بحالِ زار"
"ہر سمت خیل خیل سپاہِ غنیم ہے   لیکن اِدھر ہیں قلعے میں گنتی کے جاں نثار"
"تیری دلاوری پہ ہے دار و مدارِ زیست   تیری کمک پر اب ہے رہائی کا انحصار"
"گر راجپوتی خون رگوں میں ہے جوش زن   گر پاسِ ننگ و غیرتِ قومی ہے نامدار"
"لیکر بہادرانِ جری، پر لگا کے آ!   جانوں پہ بن ہی ہے نہیں تابِ انتظار"
"کل تک یہاں پہنچنے میں تاخیر کی اگر   ڈھونڈے نہ پھر ملیگا ہمارا کہیں غبار"
قاصد کو سر بمہر لفافہ کیا سپرد   تاکیدِ التماسِ زبانی بھی کی ہزار

خط لیکے راتوں رات ہوا نامہ بر ہوا
ظلمت ہوئی رسائیِ قسمت سے پردہ دار

پہنچا دمِ طلوعِ سحر تا درِ اُمید   نامہ اُمید سنگھ کو دیکر لیا قرار
پڑھتے ہی راجپوت کے تیور بدل گئے   اُبلا رگوں میں خون، بڑھا جوشِ اضطرار
فوراً دلاوروں کو دیا حکم کوچ کا   لڑنے کو مثلِ سیل چلے تیز رَو سوار
بجلی کی طرح ٹوٹ کے یکبار جا گرے   پھیلا دیا صفوں میں حریفوں کی انتشار
لوہے سے لوہا بجنے لگا رزمگاہ میں   دریائے خوں بہانے لگی تیغِ آبدار
محصور اُدھر سے قلعے کا دروازہ کھولکر   طوفانِ بے پناہ کی صورت ہوئے دوچار

آفت کا سامنا تھا سپاہِ غنیم کو　　دونوں طرف سے طرفہ قیامت تھی آشکار

رَن میں قدم نہ لشکرِ شاہی کے جم سکے　　لی رزمگہ سے پیٹھ دکھا کر رہِ فرار

پسپا ہوئے حریف جو کھا کر شکستِ فاش　　اُمید سنگھ کے ہاتھ تھا میدانِ کارزار

راجہ نے دیکھتے ہی گلے سے لگا لیا　　لیکر بلائیں گنجِ جواہر کیا نثار

پھر یہ کہا کہ تیری کمک سے ظفر ہوئی　　کیونکر کروں میں شکر ادا تیرا غم گُسار

جو مجھ سے مانگتا ہے تجھے آج مانگ لے　　دیتا ہوں سچے دل سے تجھے قول تین بار

اُمید سنگھ کو آئی نظر صورتِ اُمید　　بیساختہ زبان سے نکلا کہ تاجدار

جو سب سے قیمتی ہے نگیں تیرے تاج میں　　ہے آب جس کی ضو سے ہیں دُرہائے شاہوار

پتّا ہے جس کا نام وہ ہے گوہرِ مراد　　تجھ سے امید سنگھ ہے اُسی کا اُمیدوار

راجہ کو اب تو پہلوئے انکار ہی نہ تھا　　پہلے ہی دے چکا تھا اُسے قول تین بار

پتّا کے عقد کا وہیں سامان ہو گیا
بزمِ نشاط جنگ کا میدان ہو گیا

منظومہ مارچ ۱۹۲۶ء

میراں بائی

(پہلا سین)

بھگوان کرشن کے مندر میں — ہے محوِ ثنا میراں بائی
اِک بین ہے دستِ نازک میں — لب وقفِ نغمہ آرائی
اِک سوزِ حقیقی ساز میں ہے — اِک جذبِ کشش آواز میں ہے
ہر بول سے در پردہ ہے کھُلا — جو راز کہ پردۂ راز میں ہے
کیا راگ ہے کیا لَے کاری ہے — اِک وجد کا عالم طاری ہے
جو سُر ہے پریم کٹاری ہے — جو زخم ہے زخمِ کاری ہے
ہے چرخ سے بارشِ نورِ قمر — ہے سطحِ زمیں اِک تختۂ زر
دامانِ شبِ مہتاب ہے تر — نغموں کی تراوش سے یکسر
مسحورِ فضا، سکتے کا سماں — مائل بسکوں ہے رُوحِ رواں
ہر موجِ صبا ہے کیف فشاں — سرمستِ مئے نغمہ ہے جہاں
احساسِ خودی کافور ہوا — عرفان سے دل معمور ہوا
یکرنگ پریمی پریتم ہیں — اب پردۂ حائل دُور ہوا

(دوسرا سین)

اکبر اور تان سین آتے ہیں　　خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں
لہروں میں بحرِ ترنُّم کی　　خود سرتا پا کھو جاتے ہیں
عرفان کا میخانہ ہے کھُلا　　جو آیا مستِ الست ہوا
کچھ شاہ و گدا کا فرق نہیں　　ہموار بلند و پست ہوا
جب آنکھیں کھولیں میراں نے　　ان دونوں نے پرنام کیا
سر اپنا جھکا کر قدموں پر　　یوں فرطِ ادب سے کلام کیا
اے دیوی! کرشن مُراری کو　　ہم بھینٹ چڑھانے آئے ہیں
تیرے رُوحانی نغموں سے　　کھنچ کر دیوانے آئے ہیں
لے یہ ہیروں کی مالا ہے　　یہ ادنےٰ نذر ہماری ہے
کر ارپن اُس کی سیوا میں　　تو جس کی پریم بھکاری ہے
میراں نے نذرِ عقیدت کو　　بھگوَن کے گلے میں ڈال دیا
سچّے جذباتِ پرستش نے　　بیساختہ اپنا کام کیا

(تیسرا سین)

جب رانا نے یہ حال سُنا　　تو فرطِ غضب سے آگ ہوا

ننگ و رسوائی کا باعث   میراں کا سچا تیاگ ہوا
دل میں یہ خیالِ خام آیا   میواڑ کی عزت خاک ہوئی
کیوں پیشِ نگاہِ نامحرم   میراں اتنی بیباک ہوئی
اک ساغرِ زہرِ ہلاہل کا   رنواس میں فوراً بھیج دیا
بھگوان کا لیکر نام اُسے   میراں نے بے وسواس پیا
بھگتی کے اثر سے زہر میں بھی   تاثیرِ آبِ حیات ہوئی
یہ چال بھی جب سیدھی نہ پڑی   راناؔ کی بازی مات ہوئی
جز دیس نکالا دینے کے   اب اور کوئی چارہ نہ رہا
یہ حکم سنا جب میراں نے   تو ضبط کا پھر یارا نہ رہا
لی راہ وہیں بندرابن کی   چھوڑا رنواس بروگن نے
ملبوس فقیرانہ پہنا   بنسی بٹ والے کی جوگن نے

(چوتھا سین)

بندرابن سارا گونج اُٹھا   جوگن کی مست صداؤں سے
درشن کو لوگ اُمڈ آئے   شہروں سے گاؤں گاؤں سے
میلہ سا ہر دم رہنے لگا   میراں کے عقیدتمندوں کا

دل سیر سُریلی تانوں سے　　ہوتا تھا نہ پریم کے بندوں کا
چھپ چھپ کے اندھیری راتوں میں　　خود کرشن مُراری آتے تھے
سوئی ہوئی قسمت میراں کی　　جلووں سے اپنے جگاتے تھے
جس وقت کدم کی چھاؤں میں　　یہ جوگن بین بجاتی تھی
وجد آفریں نغموں سے ہر سُو　　حالت طاری ہو جاتی تھی
انسان ہی کیا، حیوان ہی کیا　　سرشار در و دیوار ہوئے
طائر اُڑنے سے باز رہے　　اور رقص کناں اشجار ہوئے
بھگتی کا میراں بائی کی　　شہرہ جو قریب و دُور ہوا
راناؔ مشتاقِ دید ہوا　　بے چین دلِ مہجُور ہوا

(پانچواں سین)

زرتار لباس بدل ڈالا　　بیتابِ گدائے اُلفت نے
رُخ بندرابن کی سمت کیا　　پروانۂ شمعِ محبت نے
دیکھا تو کنارِ آبِ رواں　　جوگن مصروفِ پرستش ہے
لب پر وہی نغمۂ دلکش ہے　　رُخ پر وہی رنگِ تابش ہے
اِس چشمِ سراپا شوق سے جب　　میراں کی نگاہیں چار ہوئیں

دونوں کی آنکھیں بھر آئیں — اشکوں سے گوہر بار ہوئیں
رانا نے کہا "اے پریم لتا! — میں تیرا ادنےٰ خادم ہوں
سرزد جو خطائیں مجھ سے ہوئیں — سنو! دل سے اُن پر نادم ہوں"
میراں کے لبِ گُلگوں سے مگر — اِک لفظ بھی صاف نکل نہ سکا
اشکوں کا تار نہ ٹوٹ سکا — دل فرطِ الم سے سنبھل نہ سکا
بیساختہ دونوں ہاتھ اپنے — راناؔ کے گلے میں ڈال دیے
آورش دکھایا بھگتی کا — سب شکوے دل سے نکال دیے

(منظومہ اگست ۱۹۲۷ء)

قوسِ قزح

بالائے آب دوڑتی پھرتی ہیں کشتیاں — دامانِ بحر پر ہیں سفینے رواں دواں
بادل ہوا میں اُڑتے ہیں جو زیرِ آسماں — ان میں جو دلکشی ہے سفینوں میں وہ کہاں

دریاؤں پر بندھے ہوئے پُل ہیں جا بجا — وہ سب بجائے خود ہیں نہایت ہی خوشنما

قوسِ قزح سے اُن کو مگر واسطہ ہے کیا　　جلوہ نمائی اسکی ہے زینت دہِ خلا

گردوں سے ایک جادۂ رنگیں ہے تا زمیں

شکلِ کمان خمیدہ، مگر کتنا دلنشیں

(ترجمہ)　　منظومۂ مارچ ۱۹۱۲ء

شام

سورج ڈوبا ہوا اندھیرا　　چڑیاں لینے لگیں بسیرا

دن کا غائب ہوا اُجالا　　تاریکی نے پردہ ڈالا

جلنے لگے دیئے گھر گھر میں　　گرجا، مسجد اور مندر میں

پوجا میں ہے دھیان میں کوئی　　کھانے کے سامان میں کوئی

چرخِ بریں پہ چمکے تارے　　بے روغن ہیں روشن سارے

ہلکا ہلکا نور ہے اِن کا　　بستی سے گھر دور ہے اِن کا

بچے نیند میں غافل ہو گئے　　لوری سنتے سنتے سو گئے

جنگل سے گھر گوالے آئے　　ریوڑ اپنا سنبھالے آئے

جا پہنچے مزدور گھروں میں　　خوش خوش ہیں بیوی بچوں میں

دن بھر کب آرام لیا ہے — خون پسینہ ایک کیا ہے
شام نے دی ہے کام سے فرصت — دم لینے کی ملی ہے مُہلت
اب سوئیں گے لمبی تانے — محنت لگے گی خوب ٹھکانے
منزل پر رہرو جا پہنچے — ہارے تھکے، نیند کے ماتے
کشت و چمن سنسان پڑے ہیں — خالی اب میدان پڑے ہیں
پہلا سا غُل شور کہاں ہے — دوڑ دھوپ کا زور کہاں ہے
مائلِ راحت ہوا زمانہ — ختم ہوا دن کا افسانہ

چہل پہل دو چار گھڑی ہے
سب کے سرہانے نیند کھڑی ہے

منظومہ فروری ۱۹۲۱ء

برسات کی شام

ڈھل چکا ہے دن سہانی شام ہے برسات کی — آمد آمد ہے شبستانِ جہاں میں رات کی
مہرِ انور گوشۂ مغرب میں پنہاں ہو گیا — چرخ زنگاری شفق سے گُل بداماں ہو گیا
بادلوں کے زیب بر میں جامہ ہائے دیدہ زیب — جن کی رنگینی کا نظّارہ ہے کتنا دلفریب

ایک کا ہے دوسرے سے رنگ زینت میں فزوں
قرمزی، اودا، سنہری، لاجوردی، لالہ گوں

دور سے بادل نظر آتے ہیں سونے کے پہاڑ
قصرِ فیروزہ میں آویزاں ہیں یا کندن کے جھاڑ

پردۂ زریں پڑے ہیں گنبدِ افلاک پر
ہلکے ہلکے نور کی بارش ہے فرشِ خاک پر

کوئی در پردہ لبِ بامِ فلک گل ریز ہے
یا فضا رنگینیوں سے سر بسر لبریز ہے

ہلکے گہرے مختلف رنگوں کی ہے کیسی نمود
تختۂ گلہائے رنگا رنگ ہے چرخِ کبود

ساحتِ گردونِ گرداں پر کھلا ہے لالہ زار
یہ ہیں سب کلکِ شعاعِ مہر کے نقش و نگار

کس قدر دلکش ہیں قدرت کے مناظر واہ واہ
نت نئی آرائشیں ہیں ہر طرف شام و پگاہ

چشمِ بینا ہو تو دنیا شعلہ زارِ حسن ہے
برق اس گلشن کا ہر ذرہ شرارِ حسن ہے

(منظومۂ ستمبر ۱۹۲۶ء)

جلوۂ بسنت

بسنت لائی نویدِ بہارِ خندۂ گل　　نگاہِ شوق ہوئی کامگارِ خندۂ گل
نکھار پر ہے رُخِ تابدارِ خندۂ گل　　خزاں کو پھونک نہ ڈالیں شرارِ خندۂ گل
چمن میں آگ نہ لگ جائے آتشِ گل سے
کچھ اور گل نہ کھلے دودِ آہِ بلبل سے

زہے نشاط بھر آرائشوں کا ساماں ہے　　نگار خانۂ چیں تختۂ گلستاں ہے
سُرور کا ہے سماں زینت فراواں ہے　　شگفتہ پھول ہیں نظارۂ گل بداماں ہے
نظر نواز ادائیں ہیں حسنِ فطرت کی
بساطِ خاک پہ گلکاریاں ہیں قدرت کی

نسیمِ صبح میں ہے رنگِ گلشن آرائی　　سکھا رہی ہے شگوفوں کو نازِ رعنائی
گلوں کی دید کے قابل ہے شانِ زیبائی　　کہ چشمِ نرگسِ شہلا بھی ہے تماشائی
رُخِ چمن سے نئی تازگی ہویدا ہے
شجر نہال ہیں رنگِ بہار پیدا ہے

ادائے ناز سے شاخِ شجر لچکتی ہے　　برنگِ شبنمِ تر تازگی ٹپکتی ہے

قبائے غنچۂ دلتنگ پھر مسکتی ہے   لبوں سے نکلے تبسّم خوشی جھلکتی ہے
چٹک سے کلیوں کی مُہرِ سکوت ٹوٹ گئی
طفیلِ بادِ صبا بُو چمن کی پھُوٹ گئی

شبابِ موسمِ سرما ہوا زوال پذیر   جہاں میں آب و ہوا کی بدل گئی تاثیر
شگفتہ ہونے لگا غنچۂ دلِ دلگیر   بہارِ گُل کی نگاہوں میں کھنچ گئی تصویر
بسنتی رنگ کی پوشاک زیب دینے لگی
ادائے ماہ جبیناں فریب دینے لگی

پگھل کے بہنے لگی برف کوہساروں سے   عیاں ہے جوشِ روانی کا آبشاروں سے
بلند خاک کا رتبہ ہے لالہ زاروں سے   کہ پھول کرتے ہیں چشمک زنی ستاروں سے
طرب فزا ہیں ہوائے بسنت کے جھونکے
عجب بہار دکھاتے ہیں کھیت سرسوں کے

سرور بخش یہ رُت آ کے سال آتی ہے   پیامِ فصلِ بہاری ہمیں سناتی ہے
چمن میں سبزۂ خوابیدہ کو جگاتی ہے   ہنسا ہنسا کے شگوفوں کو گُل کھلاتی ہے
اِسی سے کیفِ شرابِ نشاط تازہ ہے
کہ رُتِ بسنت کی رُوئے چمن کا غازہ ہے

منظومہ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

ٹیسُو کے پھُول

ہے جنّتِ نظّارہ بہارِ گُلِ ٹیسو
رنگینیٔ لالہ ہے نثارِ گُلِ ٹیسو

وہ شعلہ ادائی انہیں قدرت سے ملی ہے
اک جلوۂ رنگیں ہے بہارِ گُلِ ٹیسو

یہ آگ سی بھڑکی ہوئی ہے ڈھاک کے بن میں
یا جلوہ فشاں ہیں یہ شرارِ گُلِ ٹیسو

روشن ہیں سرِ شاخِ شجر شمع ہزاروں
یا رشکِ چراغاں ہے یہ نارِ گُلِ ٹیسو

یا روئے زمیں پر شفقِ شام کھلی ہے
یا جوش پر آئی ہے بہارِ گُلِ ٹیسو

یا دور سے ہوتا ہے شبِ ماہ میں دھوکا
یا پارۂ آتش ہے عذارِ گُلِ ٹیسو

بس جائے نہ کیوں دیکھنے والوں کی نظر میں
یہ جلوۂ رنگیں، یہ بہارِ گُلِ ٹیسو

مٹ مٹ کے بھی رنگینیاں جاتی نہیں انکی
کیا دستِ خزاں سے ہو فشارِ گُلِ ٹیسو

مستِ مئے نظّارہ جو ہوتی ہیں نگاہیں
مشکل سے اُترتا ہے خمارِ گُلِ ٹیسو

نیرنگیاں ہولی کی ہیں موقوف انہی پر
ہے جوہرِ صد رنگ غبارِ گُلِ ٹیسو

کیوں برقؔ نہو صفحۂ قرطاس شفق گوں
ہر مصرعۂ تر میں ہے بہارِ گُلِ ٹیسو

منظومہ مارچ ۱۹۲۲ء

ہولی

زیبِ چمن و دہر بصد ناز ہے ہولی — ہنگامہ فزا ہے طرب انداز ہے ہولی
ہاتھ آ گیا مستوں کے مسرت کا بہانہ — رندانِ قدح خوار کی دمساز ہے ہولی
یہ روح نئی پھونکتی ہے مُردہ دلوں میں — جادو ہے کرشمہ ہے کہ اعجاز ہے ہولی
رنگینیاں ہولی کی ہیں چہروں سے نمایاں — آئینۂ رخسار ہے غمّاز ہے ہولی
پچکاریاں ہاتھوں میں لیے پھرتے ہیں بچّے — اک دورِ طرب بہرِ تگ و تاز ہے ہولی
ہولی کا مزا جب ہے کہ تہذیب سے کھیلیں — پاکیزہ ہو اسلوب تو ممتاز ہے ہولی
جو بادہ پرستی میں لُٹاتے ہیں زر اپنا — ایسوں کیلئے خانہ بر انداز ہے ہولی
ہر ساز پہ اس نغمے کا انداز جدا ہے — تاثیر میں ڈوبی ہوئی آواز ہے ہولی
اس رُت میں ہیں گلکاریاں قدرت کی نمایاں — فردوسِ نظر بہرِ نظر باز ہے ہولی
شادابیِ گلزار ہے اب دید کے قابل — ہر خندۂ گُل میں اثر انداز ہے ہولی
کھیتوں میں یہی فصل کے پکنے کا ہے موسم — قدرت کا ہے تہوار، سرافراز ہے ہولی
پرہلاد کی بھگتی کا نہاں اس میں ہے اسرار — عرفان و تصوف کا کھلا راز ہے ہولی

یہ محفلِ احباب یہ تہوار مبارک
ہولی کا یہ دن، برق کے اشعار مبارک

منظومہ فروری ۱۹۲۵ء

سرس کے پھول

وہ بھینی بھینی مہک ہے سرس کے پھولوں میں نسیمِ صبح نکلتی ہے بس کے پھولوں میں
شبابِ موسمِ گرما کی جان ہیں یہ پھول نصیب ہے انہیں خوشبو سے رنگِ حسنِ قبول
رخِ سپید پہ ان کے نگاہ شیدا ہے کہ جس میں ہلکی سی سبزی کا رنگ پیدا ہے
یہ پھول کیا ہیں سراپا ہیں دستۂ رگِ گل پئے نظارہ ہے درکار دیدۂ بلبل
یہ نرم نرم عروسِ بہار کے ہیں چنور جگہ ملی ہے جنہیں سبز سبز شاخوں پر
گہر فشانیٔ شبنم بھی ان گلوں پہ ہے بار گراں ہے ان کی نزاکت پہ موجِ بادِ بہار
جوابِ تارِ رگِ گل ہیں ڈنڈیاں ان کی کہ رشکِ موئے حسیناں ہیں پتیاں ان کی

ضیا فروزِ نظر ان کا روئے صافی ہے
یہ گل نہیں، یدِ قدرت کی موشگافی ہے

(منظومہ اپریل ۱۹۲۵ء)

چمپے کی کلیاں

یہ چمپے کی کلیاں ہیں کیا عطر بیز — دل آویز ہے جن کی خوشبوئے تیز
معطر ہے اِن کی مہک سے دماغ — سُرورِ طرب سے ہے دل باغ باغ
کوئی ہے شگفتہ کوئی نیم وا — تبسّم کی اِن کے ہے بانکی ادا
یہ کلیاں ہیں رنگیں ادائی میں فرد — دیا ان کو قدرت نے ملبوسِ زرد
وہ حُسنِ دل افروز کی شان ہے — کہ رنگِ طلا جس پہ قُربان ہے
لطیف ان کی ہیں اچھوتی پتیاں — صفائے رُخِ صاف جن سے عیاں
کہاں اور پھولوں میں ایسے ہیں گُن — کہاں اُن میں یہ نکہتِ مست کُن
کہاں کیتکی میں یہ رعنائیاں — کہاں اُس میں یہ بزم آرائیاں
کہاں نسترن میں ہے یہ رنگ و بُو — کہاں اس قدر مشک بیزی کی خُو
رکھیں چار کلیاں اگر وقتِ شام — مہک جائے محفل کی محفل تمام
نرالا ہے ان کی نزاکت کا ڈھنگ — نگاہوں کی حدت سے اُڑتا ہے رنگ
یہ کلیاں ہیں دوشیزگانِ بہار — اچھوتی ادائیں ہیں ان میں ہزار

حسینوں کو لگتی ہے اِتنی بھلی
ہیں زیبِ گلو بن کے چمپا کلی

منظومہ اپریل ۱۹۲۵ء

شکتی بان

(لکشمن جی کے شکتی بان لگنے پر رام کا وِلاپ)

تو شکتی بان کھا کے جو لے ہوش میں ہے
فرطِ الم سے جانِ حزیں کشمکش میں ہے

چھائی ہوئی جو رُخ پہ ترے مُردنی سی ہے
مُنھ دیکھ کر ترا مجھے خود جانکنی سی ہے

بیحس پڑا ہوا ہے جو تو فرشِ خاک پر
گرتی ہیں بجلیاں دِلِ اندوہناک پر

تو گود میں اَجل کی جو سرگرمِ خواب ہے
اِک اِک نفس مجھے دمِ تیغِ پُر آب ہے

کیا حادثہ یہ گردشِ قسمت دکھا گئی
کیوں لکشمن! مجھے تری آئی نہ آ گئی

بیہوش ہو کے رَن میں جو تو خاک پر گرا
آ کاش کیوں نہ سر پہ مرے ٹوٹ کر گرا

آنکھوں کے سامنے مری تو غرقِ خوں ہوا
میرا نہ حال کیوں ترے آگے زبوں ہوا

کیوں اگنی بان سے ترا دل چاک ہو گیا میں کیوں نہ جل کے تیری جگہ خاک ہو گیا
دشمن کا تیر تجھکو پیام قضا ہوا تیری بجائے کیوں نہ مرا دم فنا ہوا

اے لکشمن! ابھی ترے مرنے کے دن نہ تھے
مجھ جاں بلب سے پہلے گزرنے کے دن نہ تھے

تو میرے دل کا چین تھا آنکھوں کا نور تھا تیرے ہی دم سے مجھکو میسر سرور تھا
سب بھائیوں میں جان سے پیارا تھا ایک تو لے دیکھے اس بپت میں سہارا تھا ایک تو
میرا شریک درد رضا جو تھا تو مرا سچ تو یہ ہے کہ قوت بازو تھا تو مرا
تجھ سے ہی دل قوی تھا مرا رزمگاہ میں راون کو تیرے بل پہ سمجھتا تھا کاہ میں

بے دست و پا ہے رام جو لچھمن جتی نہیں
بے سر ہے فوج تجھسا جو سینا پتی نہیں

آنکھیں تو کھول لب تو ہلا کیوں خموش ہے ہے میرا دم لبوں پہ کچھ اسکا بھی ہوش ہے
زانو پہ کس کے سر ہے ذرا دیکھ تو ادھر یہ کون نوحہ گر ہے ذرا دیکھ تو ادھر
منھ تک رہا ہوں منھ سے ذرا بول تو سہی او محو خواب آنکھ ذرا کھول تو سہی
مجھ غمزدہ کا آخری ارمان نکال دے بھیا مرے گلے میں تو باہیں تو ڈال دے

آیا تھا میرے ساتھ اجودھیا سے بن میں تو
تنہا غضب ہے چھوڑ چلا آج رن میں تو

بچپن سے ایک جان دو قالب رہا ہے تو مطلوب ہیں ترا مرا طالب رہا ہے تو
اپنی نظر سے دور نہ اک پل کیا کبھی مجھ کو نہ تو نے آنکھ سے اوجھل کیا کبھی
سایہ کی طرح میرے رہا ساتھ ہر گھڑی تو دستِ راست تھا جو مصیبت کوئی پڑی
بن باس میں بھی ساتھ دیا راج چھوڑ کر خاکِ قدم کو سر پہ رکھا تاج چھوڑ کر

مانا کہ اور لاکھ ہیں آرامِ جاں حبیب
اب تجھ سا جاں نثار برادر کہاں نصیب

کس منہ سے میں دھر دنگا اجودھیا میں پاؤں اب پاؤں گا لچھمن میں کہاں تیری چھاؤں اب
تجھکو میں اپنے ساتھ جو لیکر نہ جاؤں گا ماتا سومترا کو میں کیا منہ دکھاؤں گا
پوچھیں گے جب بھرت تو میں دونگا جواب کیا مجھ میں ہے کی آنکھ ملانے کی تاب کیا
تیرے بغیر قالبِ بیجاں ہے تن مرا اے کاش پیرہن ہی مرا ہو کفن مرا

بیکل ہے دم نکلنے کو تن سے بیوگ میں
سیتا کا دکھ بھی بھول گیا تیرے سوگ میں

محو اس طرف تو رام تھے فریاد و آہ میں ناگاہ شور مچ گیا ساری سپاہ میں
پربت سے بوٹی لیکے ہنومان آگئے مردہ دلوں کے کھوئے ہوئے پران آگئے
سرجیونی نے معجزہ اپنا دکھا دیا فی الفور محوِ خوابِ عدم کو جگا دیا

اُٹھتے ہی لکشمن نے لیے رام کے قدم — دونوں بڑھا کے ہاتھ گلے سے ملے بہم
ہر سُو صدا بلند ہوئی خاص و عام کی
جے لکشمن کی، جے ہو مہاراج رام کی

منظومہ اکتوبر ۱۹۱۵ء

بن باسیوں کی وطن میں آمد

اپنے بھگت کے راج تلک کر چکے جو رام — بن باس کا قریب ہوا وقتِ اختتام
پھرنے لگی نگاہ کے آگے اودھ کی شام — لنکا میں ایک رات بھی دو بھر ہوا قیام
بھر آئی چشمِ شوق خیالِ وطن کے ساتھ
یاد آیا اپنا قول بھرت کے بچن کے ساتھ
کی ہاتھ جوڑ کر یہ بھبھیکن نے التماس — میں کیا کہوں حضور تو خود ہیں ادا شناس
جو دل میں ہے نگاہ سے کر لیجئے قیاس — اُمیدوار ہو نہ کہیں مبتلائے یاس
پروانگی کا حکم دیا ہنس کے رام نے
چرنوں پہ اپنا سیس جھکایا غلام نے
مُنھ مانگی مل گئی جو یہ لنکیش کو مُراد — رخصتِ سفر درست کیا ہو کے شاد و شاد

حاضر کیا کبیر کا زرتار تخت یاد جسکی سُبک رَوی پہ تھا برقِ طپاں کا صاد
پھُولوں سے اِس اَدا سے سجا یا ہوا تھا وہ
بُو کی طرح گلوں میں سما یا ہوا تھا وہ
رکھا قدم جو رام نے پُشپک بِوان پر ہر سمت نور پھیل گیا آسمان پر
شمس و قمر نثار ہوئے آن بان پر بجلی تڑپ کے رہ گئی جلوے کی شان پر
تابش یہ تھی کہ نکلے ہیں گویا ہزار چاند
سیتا سے لکشمن سے لگے اور چار چاند
تخت ہوائی اُڑ کے سُوئے آسماں چلا سایہ زمیں پہ عرش پہ نُور رواں چلا
اوجِ فلک سے خاک پہ جلوہ فشاں چلا بجلی سی ایک کوند گئی یہ جہاں چلا
تھا اِضطرابِ برق بھی گرد اسکی چال سے
باہر تھیں اس کی تیزیاں حدِ خیال سے
پھر کر جو دم زدن میں طرارے رواں ہوا لنکا کا کوٹ گردِ پسِ کارواں ہوا
تختِ سُبک نہ موجِ صبا پر گراں ہوا جھپکی پلک تو آنکھ سے اوجھل نشاں ہوا
آنکھوں کو صاعقے کا گماں ہو کے رہگیا
اِک نُور تھا کہ جلوہ فشاں ہو کے رہگیا
جاتا تھا عرش پر یہ غبار اُڑا ہوا یا گرمِ راہِ شوق تھا پارا اُڑا ہوا

تھا جلوہ تاب کوئی شرارا اُڑا ہوا یا جا رہا تھا ٹوٹ کے تارا اُڑا ہوا
روشن تھا سب محیطِ خلا تابِ نور سے
قندیلِ عرش یہ نظر آتا تھا دور سے

آئے وطن کی راہ میں مشہور جو مقام سیتا کو وہ دکھائے شری رام نے تمام
وہ رزمگہ چلی تھی جہاں تیغِ بے نیام جس جا ہوا تھا فتح سے راون کی سنگرام
جیتا تھا لکشمن نے جہاں اندرجیت کو
قائم رکھا تھا رن میں رگھوکل کی ریت کو

وہ سیت بندھ حملۂ لنکا کی یادگار شیوجی کا وہ شوالہ وہ دریائے بیکنار
وہ پمپا پور وہ دامنِ صحرا وہ کوہسار سگریو سے بندھا تھا جہاں عہدِ استوار
بالی کے بان آڑ سے مارا تھا جس جگہ
بحرِ جہاں سے نزع میں تارا تھا جس جگہ

کی آہِ سرد پنچ وٹی جب نظر پڑی اُجڑی ہوئی کٹی سے نگہ رہ گئی لڑی
یاد آ گئی جو بن میں پڑی تھی بپت کڑی مایا کا وہ طلائی ہرن ہجر کی گھڑی
سیتا ہرن کی پھر گئی تصویر آنکھ میں
آنسو نہ رک سکے کسی تدبیر آنکھ میں

تھا روبرو اگست منی کا پھر آشرم گوداوری کا حسنِ دلآویز جوشِ یم

منظرِ نفس نفس جو بدلتا تھا یک قلم　　دم بھر میں چترکوٹ پہ تھا تختِ برق دم
سنگم کا پھر جمالِ دل آرا تھا سامنے
پریاگ راج کا وہ نظارا تھا سامنے

آئی اجودھیا کی نظر دور سے بہار　　محلوں کے تا بہ کلس قصرِ زرنگار
سرجو کی لہر بہر وہ آبِ رواں کی دھار　　وہ شہر کی فضا لبِ ساحل وہ سبزہ زار
بن باسیوں کو دیدِ وطن کی ہوئی نصیب
پھولوں کو بازگشت چمن کی ہوئی نصیب

منظومہ ستمبر ۱۹۲۲ء

دسہرہ

لنکا میں اُدھر فتح کا اُڑتا ہے پھریرا　　بھارت میں اِدھر رنگ مسرت کا ہے گہرا
اس دور میں سب کو ہے مئے عیش سے بہرا　　ہر لب پہ یہ فقرہ ہے "مبارک ہو دسہرا"
راون پہ شری رام ظفریاب ہوئے آج
برہم غم و اندوہ کے اسباب ہوئے آج

گھر گھر ہے بپا گرمیِ ہنگامۂ محفل　　اب بزمِ جہاں ہے ہمہ تن عیش کی منزل

فردوس کا منظر ہے نگاہوں کے مقابل معمورِ مسرت سے ہیں عشرت کدۂ دل

جے کاروں کی ہر سمت صدا گونج رہی ہے

تا گنبدِ افلاک فضا گونج رہی ہے

نوروز ہے جس دن پہ فدا آج وہ دن ہے بنیادِ ستم ہوگئی تاراج وہ دن ہے

راون کا سرِ خاک گرا تاج وہ دن ہے لنکا کا بھبیکن کو ملا راج وہ دن ہے

آزاد ہوئیں جانکی جی قیدِ محن سے

نکلا مہِ انوار فشاں آج گہن سے

اُس عہدِ مقدس کی نشانی ہے یہ تہوار جس وقت لیا تھا شری بھگوان نے اوتار

دنیا سے مٹا کر ستم و جور کے آثار معمورۂ ہستی کو کیا مطلعِ انوار

جب زینتِ محفل وہ خود آرا نظر آیا

ست جگ کا تریتا میں نظارا نظر آیا

آتا ہے نئی شان سے ہر سال دسہرا کیا روزِ مبارک ہے یہ خوش فال دسہرا

ماضی کا سناتا ہے ہمیں حال دسہرا گویا ہے شعاعِ مہِ اقبال دسہرا

دیتا ہے ہمیں عظمتِ پیشیں کا سبق یہ

تاریخ کا بھارت کی سنہری ہے ورق یہ

منظومہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

بھرت ملاپ

ضیا فروش ہے وہ جلوۂ بہارِ اودھ		کہ آج صبحِ بنارس ہے شرمسارِ اودھ
فروغِ نور سے ہر ذرّہ جلوہ ساماں ہے		ہوئی ہے غیب سے آرائشِ دیارِ اودھ
پھرے ہیں چودہ برس بعد دن زہے قسمت		پھر آج از سرِ نو آئی ہے بہارِ اودھ
وفورِ جلوۂ گل سے زمین ہے گلپوش		ہے رشکِ دامنِ گلزار رہگزارِ اودھ
ہوئی ہے شہر میں ہر سمت آئینہ بندی		بنے ہیں شیش محل قصر تا بہ دیارِ اودھ
کس اوج موج سے بہتی ہے دھارا سرجو کی		ہے کہکشاں کی طرح زینتِ کنارِ اودھ
سجی ہوئی ہے اجودھیا پوری دلہن کی طرح		کہ آج جلوہ فگن ہوگا تاجدارِ اودھ
ہر ایک دل ہے مئے انبساط سے مسرور		ہر ایک آنکھ ہے سرگشتۂ خمارِ اودھ
بھرے ہیں موتیوں سے تھال آرتی کیلیے		کھڑی ہیں در پہ حسینانِ گلعذارِ اودھ

جو آئیں رام تو سر پر گہر نثار کریں
دھریں جو پاؤں تو قدموں پہ سر نثار کریں

بھرت بھی باندھے ہوئے دھیان آس بیٹھے ہیں		خیالِ رام میں محوِ سپاس بیٹھے ہیں
مکٹ جٹاؤں کا پہنے کُشا کے آسن پہ		بنے ہوئے رشی رگھبر کے داس بیٹھے ہیں

حیات کرتے ہیں بن باسیوں کی طرح بسر
محل میں پہنے فقیری لباس بیٹھے ہیں

کھڑاویں رام کی رکھی ہیں تختِ زرّیں پہ
ادب سے سر کو جھکائے یہ پاس بیٹھے ہیں

عیاں ہے کیفِ مئے انتظار آنکھوں سے
مثالِ پیکرِ اُمّید و یاس بیٹھے ہیں

امید و بیم سے دل میں عجب تلاطم ہے
کچھ انبساط میں ہیں کچھ اُداس بیٹھے ہیں

کبھی خیال یہ آتا ہے کچھ قصور ہوا
مجھے بھلائے جو وہ حق شناس بیٹھے ہیں

کبھی یہ سوچتے ہیں خوش نصیب ہیں لچھمن
کہ میں تو دور ہوں وہ اُن کے پاس بیٹھے ہیں

نہ آئے رام تو ہم بھی پران تج دیں گے
یہ دل میں ٹھانے ہوئے بے ہراس بیٹھے ہیں

یہ منتظر تھے کہ شاہی نشان آ پہنچا
پلک جھپکتے ہی پُشپک بِوان آ پہنچا

نوید لیکے ہنومان سبز گام آئے
کہ رام جیت کے لنکا کو شادکام آئے

حیاتِ تازہ ملی سن کے مژدۂ جاں بخش
بھرت کی جان میں جان آ گئی جو رام آئے

نظر پڑے جو شری رام لچھمن سیتا
سرِ نیاز جھکائے سبک خرام آئے

وششٹ جی کے قدم رام نے لیے جھک کر
گرو سے پیش با عزاز و احترام آئے

گلے لگانے کو یوں آئیں تینوں ماتائیں
کہ جیسے پیاس بجھانے کو تشنہ کام آئے

بھرت نے دوڑ کے خاکِ قدم رکھی سر پہ
ہجومِ شوق کا آنسو لیے پیام آئے

نہ نکلی بات بھی پوری برائے پرسشِ حال
لبوں تک آئے تو کچھ لفظ ناتمام آئے

بڑھا کے ہاتھ بغلگیر بھائی بھائی ہوئے
بدھائی دینے اجودھیا کے خاص و عام آئے

خوشی کی لہر سی سارے نگر میں پھیل گئی
وطن میں بن سے جو دونوں مہ تمام آئے

چراغ گھی کے جلے شہر میں اجالا ہوا
قدم جو رام کے آئے تو بول بالا ہوا

(منظومہ اکتوبر ۱۹۱۵ء)

دیپ مالا

دیوالی کی شبِ تاریک کا عالم نرالا ہے
خجل ہے روزِ روشن رنگ وہ اس نے نکالا ہے

نظر کیا رخ پہ ٹھہرے حسن کی تابش دوبالا ہے
تجلی نے سراپا نور کے سانچے میں ڈھالا ہے

مبارک لکشمی پوجا۔ مبارک دیپ مالا ہے
چراغوں کی ضیا باری سے گھر گھر میں اجالا ہے

یہی وہ رات ہے جلووں کا ساماں جس میں ہوتا ہے
یہی وہ رات ہے جشنِ چراغاں جس میں ہوتا ہے

یہی وہ رات ہے روشن شبستاں جس میں ہوتا ہے
یہی وہ رات ہے عالم فروزاں جس میں ہوتا ہے

یہ وہ شب ہے ضیائے صبحِ خنداں بھی ہے مات اس سے
یہ وہ شب ہے کہ تاریکی بھی ہے روشن صفات اس سے

یہی وہ رات ہے زینت ہے جو آئینہ خانوں کی
یہی وہ رات ہے کنجی ہے ربّ کے خزانوں کی

یہی وہ رات ہے قسمت جگاتی ہے مکانوں کی
زمیں پہ کھینچ لاتی ہے تجلّی آسمانوں کی

یہ وہ شب ہے شبِ مہتاب پر جو فوق رکھتی ہے
یہ وہ شب ہے تمنّا جس کی چشمِ شوق رکھتی ہے

نمایاں ظلمتِ شب میں ہے برقِ طور کا عالم
در و دیوار و طاق و بام پر ہے نور کا عالم

یہ دن کی روشنی ہے یا شبِ دیجور کا عالم
دکھائی صاف دیتا ہے قریب و دور کا عالم

نصیبہ خاک کا چمکا ہے نورانی شراروں سے
کہ مٹی کے دیے چشمک زنی کرتے ہیں تاروں سے

اودھ میں جیت کر لنکیش کو جب رام آئے تھے
تو گھر گھر جشن بھارت ورش میں سب نے منائے تھے

مکان اپنے سجا کر آئینہ خانے بنائے تھے
وفورِ شادمانی سے دیے گھی کے جلائے تھے

یہی وہ رات ہے جو یادگارِ فتحِ لنکا ہے
یہی وہ رات ہے ہر سال بجتا جس کا ڈنکا ہے

سنہری کارناموں کی اسی سے یاد تازہ ہے
یہ وہ شب ہے مجسّم عظمتِ پیشیں کا نقشہ ہے

فتوحاتِ سلف کا رُوح پرور اک نظارہ ہے ؎ کہ یہ تہوار کا تہوار ہے جلوے کا جلوہ ہے

چراغاں سے منوّر ہے اندھیری رات ماوش کی
کھُبی جاتی ہے آنکھوں میں تجلّی حسنِ دلکش کی

منظومہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء

گرو نانک

شمعِ جاں افروز، لعلِ شب چراغِ معرفت ؎ جلوہ پاشِ نورِ حق، روشن دماغِ معرفت
بیخودِ توحید، سرمستِ ایاغِ معرفت ؎ خضرِ منزل، سالکِ کنجِ فراغِ معرفت

تیری ہستی تھی سراپا پردۂ سازِ لطیف
جس کے نغموں میں نہاں قدرت کا تھا رازِ لطیف

دل ترا آگاہ تھا توحید کے اسرار سے ؎ قلبِ روشن تھا منوّر جلوۂ انوار سے
معنیِ وحدت کھلے تیرے لبِ اظہار سے ؎ تھی نوائے راز پیدا ہر نفس کے تار سے

معجزہ دکھلا گئی تاثیرِ گویائی تری
نقشِ خاطر ہو گئی تعلیمِ یکتائی تری

سب میں ایک اونکار کا جلوہ نظر آیا تجھے ؎ شش جہت میں حسنِ بے پردہ نظر آیا تجھے

روکشِ خورشید ہر ذرہ نظر آیا تجھے　　قطرہ ہم پیمانۂ دریا نظر آیا تجھے

تھی نگاہِ حق نگر تیری حقیقت آشنا
منزلِ عرفاں تھا دل، تھی آنکھ وحدت آشنا

جلوۂ حسنِ ازل سے دل ترا معمور تھا　　زنگِ نقشِ ماسوا اس آئینہ سے دور تھا
شاہدِ یکتائے عالم کا نظر میں نور تھا　　سر بسر کیفِ مئے توحید سے مخمور تھا

چشمِ عرفاں میں تری تھے کافر و دیندار ایک
جلوہ گر دیر و حرم میں تھا جمالِ یار ایک

تیرا دل تھا فیض کا چشمہ برائے خاص و عام　　ہو گئے پنجاب میں سیراب لاکھوں تشنہ کام
زندۂ جاوید ہے دارِ فنا میں تیرا نام　　اہلِ دل کے واسطے اعجاز ہے تیرا کلام

مشعلِ راہِ طلب تھا اہلِ دنیا کے لیے
دھرم کا اوتار تھا تو چشمِ بینا کے لیے

(منظومہ نومبر ۱۹۲۴ء)

دو رنگیِ زمانہ

دو رنگیِ دنیائے دُوں کے تماشے | دکھاتی ہے گردش یہاں ہر کسی کو
نزاکت سے پھولوں میں تُلتا ہے کوئی | میسّر ہے کانٹوں کا بستر کسی کو
کسی کا ہے ملبوس عُریانیِ تن | ہے تن زیبِ پیراہنِ زر کسی کو
کوئی مست ہے خندۂ جامِ مے سے | رُلاتا ہے خوں دیدۂ تر کسی کو
کوئی خاک اُفتادہ و بینوا ہے | میسّر ہے اورنگ و افسر کسی کو
کہیں رات بھاری ہے بیمارِ غم پر | ملی ہے شبِ وصلِ دلبر کسی کو
اقامت گزیں ہے کوئی قصرِ زر میں | پھراتی ہے تقدیر در در کسی کو
مگر کوئی سلطاں ہو یا بینوا ہو | مُہم ایک درپیش ہے ہر کسی کو

اجل اس جہاں سے اُٹھا کر رہے گی
مُقدّم کسی کو مؤخّر کسی کو

(منظومہ دسمبر سنہ ۱۹۲۰ء)

گُلِ تر

مُشتاقِ حُسنِ دلکش شیدائے رنگ و بُو ہوں وارفتۂ تماشا، بیتابِ جُستجو ہوں
تیری حقیقتوں سے بیگانہ ہوں سراسر
کُھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر!

تیرے جمال کا ہے دلدادہ مہرِ انور کرتا ہے یہ سُنہری کرنیں نثار تجھ پر
ہے نقشِ حُسنِ دلکش تیرا رُخِ منوّر
کُھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر!

چرخِ بریں کی مشعل یعنی مہِ درخشاں ہے تیرے گرد پھر کر دیوانہ وار رقصاں
اِس شوق کا صلہ ہے اک خندہ رُوح پرور
کُھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر!

اوجِ فلک پہ تارے ہیں محوِ دید سارے درپردہ دیکھتے ہیں یہ حُسن کے نظارے
شبنم کے کر رہے ہیں تجھ پر گُہر نچھاور
کُھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر!

جامے سے اپنے باہر ہے عندلیبِ نالاں خود رفتہ کر رہا ہے رہ رہ کے شوقِ پنہاں

مُہرِ سکوت لیکن ہے ثبت تیرے لب پر
کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر!

دامن بسا رہی ہے اپنا نسیم تجھ سے ہے موج موج اسکی عنبر شمیم تجھ سے
تیری شگفتگی سے گلزار ہے معطّر
کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر!

پانی میں عکس تیرا کیا لُطف دے رہا ہے موجوں کا آبگینہ تصویر لے رہا ہے
چشمِ نظارہ بنکر ہے ہر حباب مُضطر
کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر!

تیری شگفتگی ہے اک رازِ حُسنِ قُدرت پنہاں ہے تازگی میں اعجازِ حُسنِ قُدرت
رگ رگ میں بس رہے ہیں تیرے لطیف جوہر
کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر!

میری نظر میں تو ہے جامِ شرابِ شبنم رنگیں اداؤں کا اک جلوہ مجسّم
تصویرِ نازکی ہے یا تازگی کا پیکر
کھلتا نہیں معمّہ تو کیا ہے اے گُلِ تر!

منظومہ اکتوبر ۱۹۳۲ء

فضائے بسنت

مشاطۂ فطرت ہے محوِ چمن آرائی
ہنگامِ بہار آیا اے چشمِ تماشائی
جنگل میں ہُوا منگل مہکے گُلِ صحرائی
کھیتوں کی فضا بدلی لی سبزے نے انگڑائی
رنگِ رُخِ گُل چمکا
پھر فصلِ بسنت آئی

کیف نے گلگوں ہے مسرور ہواؤں میں
ہے جذبِ کشش پنہاں گُلشن کی فضاؤں میں
اک شانِ عروسی ہے پھولوں کی اداؤں میں
تاثیرِ محبت ہے بُلبل کی نواؤں میں
نیرنگِ جہاں بدلا
پھر فصلِ بسنت آئی

جس سمت نظر جائے، نظّارہ بدامن ہے
گہوارۂ فرحت ہے صحرا ہے کہ گُلشن ہے
ہر کشتِ تر و تازہ، رنگینی کا مخزن ہے
ہر جُوئے صفا مشرب آئینۂ روشن ہے
طائر ہیں نوا پیرا
پھر فصلِ بسنت آئی

کس درجہ سرور افزا کھیتوں کے نظارے ہیں
فردوس کے یہ نقشے قدرت نے اُتارے ہیں

پھُولی ہوئی سرسوں ہے، تابندہ شرارے ہیں　　یا خاک کے دامن میں چھٹکے ہوئے تارے ہیں
ہر سُو ہے نیا جلوہ

پھر فصلِ بسنت آئی

سُورج کی شعاعوں میں پھر گرمیِ اُلفت ہے　　کھلتی ہوئی کلیوں کو پیغامِ بشارت ہے
پھر تازہ شگوفوں کی نکھری ہوئی رنگت ہے　　پھر بُلبلِ دل خستہ آوارۂ نکہت ہے
دینے کو نیا چرکا

پھر فصلِ بسنت آئی

پھُولوں کی صباحت کا انداز نرالا ہے　　صد حیف کہ ہے شفق جس پر وہ رنگ نکالا ہے
یہ جلوۂ رنگینی دل چھیننے والا ہے　　سرمایۂ راحت ہے، آنکھوں کا اُجالا ہے
پھر جوشِ طرب پھیلا

پھر فصلِ بسنت آئی

پھر آگ لگی دل میں کوئل کے ترانوں سے　　یہ سوز کوئی پوچھے ہم سوختہ جانوں سے
پھر کہتے ہیں کچھ غنچے خاموش زبانوں سے　　رنگین ورق انکے ہیں تازہ فسانوں سے
جاڑے کا سماں بدلا

منظومہ جنوری ۱۹۲۸ء　　پھر فصلِ بسنت آئی

بچّے کی گلابی مسکراہٹ

خندۂ گُل میں یہ رنگینی کہاں یہ لطافت یہ شیرینی کہاں
اِس صباحت پر یہ نمکینی کہاں اِس میں ہے جائے سخن چینی کہاں

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گُلابی مُسکراہٹ کی اَدا

غنچۂ نو کا تبسّم زیرِ لب دلفریبی کی ادا میں ہے غضب
اُس میں پر اتنا کہاں جوشِ طرب شان ہے تیرے تبسّم کی عجب

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گُلابی مُسکراہٹ کی اَدا

دِلکُشا ہے خندۂ جامِ بلُور اُس میں ہے اک خاص کیفیّت ضرور
تازگی کا پر کہاں اتنا وفُور جس سے نُور آنکھوں کو ہو دل کو سرُور

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مُسکراہٹ کی اَدا

خُوشنما ہے سِلکِ گوہر کی دمک دِلرُبا ہے جلوۂ برقِ فلک

فرحت افزا ہے ستاروں کی چمک پر کہاں اُن میں یہ نورانی جھلک

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

نیم وا کلیوں میں بانکی آن ہے خندۂ نازآفریں کی شان ہے
حُسن ان کا تازگی کی جان ہے تجھ سے رُو کش ہوں یہ کب امکان ہے

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

مسکراہٹ شمع کی ہے دلگداز اسکے شعلے میں ہے رنگِ سوز و ساز
ہے اثر سے تازگی کے بے نیاز اس میں کب ہے یہ ادائے جاں نواز

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

خندہ زن ہوتے ہیں جب غنچے یہاں دل جلوں پر ٹوٹتی ہیں بجلیاں
اُن کا ہنسنا تو تکلف کا نشاں سادگی کا اُس میں یہ جلوہ کہاں

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

کوئی حسرت کش ہی یا مجبور ہے   شادمانی جس سے کوسوں دور ہے
لاکھ جوشِ غم سے دل معمور ہے   تجھ سے ملتے ہی نظر مسرور ہے

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

ہلکی ہلکی تیرے ہونٹھوں پر ہنسی   سایۂ فرحت ہے جانِ زندگی
موجِ رقصاں ہے صفائے قلب کی   اس میں قدرت نے بھری ہے دلکشی

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

جانفزائی اسکی اک تاثیر ہے   غمزدوں کے حق میں یہ اکسیر ہے
مرہمِ زخمِ دلِ دلگیر ہے   جس سے دل روشن ہو وہ تنویر ہے

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

جلوۂ انجم میں نور اتنا کہاں   حسن و خوبی کا ظہور اتنا کہاں
جامِ صہبا میں سرور اتنا کہاں   شادمانی کا وفور اتنا کہاں

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

آئینہ ہے قلبِ نورانی ترا پرتوافگن جسمیں ہیں صدق و صفا
جلوۂ حسنِ آفریں ہے رونما ہے تبسّم اس کا عکسِ پُر ضیا
ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

منظومہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء

نوروز

نوروز لیکے آیا ہے پیغامِ انبساط ہو رشکِ صبحِ عید یہ روشن سحر تجھے
دامن گلِ مراد سے تیرا بھرا رہے آمد ہو سالِ نو کی مسرت اثر تجھے
محفوظ چشمِ زخمِ زمانہ سے تو رہے پہنچا سکے نہ تیغِ حوادث ضرر تجھے
سرمست ساغرِ مئے حبِّ وطن ہو تو ہوں اسکے گھونٹ راحتِ قلب و جگر تجھے
خدمت میں تو وطن کی رہے محو رات دن اسکے سوا نہ آئے خیالِ دگر تجھے
حاصل تجھے متاعِ قناعت سے ہو سکون رکھے نہ مضطرب ہوسِ مال و زر تجھے
راحت ملے ہوائے زمانہ ہو سازگار
راس آئے برقؔ کی یہ دعا سر بسر تجھے

منظومہ دسمبر سنہ ۱۹۲۲

ابرِ کرم برس

اے ابرِ نوبہار تجھے ہم ترس گئے گرمی سے مہرِ شعلہ فشاں کی جھلس گئے
گلشن بجائے سبزے کے کانٹوں سے بس گئے پھولوں پر اوس پڑ گئی غنچے بکس گئے

حیرت ہے جوشِ رحمتِ باری کو کیا ہوا
دورِ خزاں ہے فصلِ بہاری کو کیا ہوا

روپوش کس جگہ ہے تو اے ابرِ دجلہ بار تیرے لئے ہیں ہم ہمہ تن چشمِ انتظار
برسات کی فضا کو نگاہیں ہیں بیقرار جوشِ بہار، جلوۂ گل، حسنِ سبزہ زار

آتے ہیں یہ مناظرِ دل کش نظر کہاں
ساون کی اب جھڑیاں ہیں اے ابرِ تر کہاں

تیرے بغیر کشت و چمن خشک ہو گئے جنگل میں دوب تک نہیں بن خشک ہو گئے
سوکھا ہے اتنا خون بدن خشک ہو گئے تر دامنوں کے اب کے دہن خشک ہو گئے

کالی گھٹا نہیں ہے تو پینے کا لطف کیا
تر ہے بدن پسینے سے جینے کا لطف کیا

حسرت سے دیکھتے ہیں سوئے آسماں کسان بادل کا نام کو نظر آتا نہیں نشان

بارش کہاں ہے آ، ادا ہوئی کھیتیوں کی جان　　پھرتے ہیں جانور بھی نکالے ہوئے زبان

پیاسی زمین ہے، تو شجر تشنہ کام ہیں
رندانِ بادہ خوار بھی آتش بہ جام ہیں

تاخیر کس لیے ہے یہ ابرِ کرم برس　　بارش بغیر خلق کا ہے لب پہ دم برس
اب تابِ انتظار نہیں بیش و کم برس　　ہے رحمتِ کریم کی تجھ کو قسم برس

ایسا برس کہ دورِ زمانے سے کال ہو
جنگل ہرے ہوں سبزۂ گلشن نہال ہو

منظومہ اگست سنہ ۱۹۲۸ء

عنوانِ بہار

آنکھ ہو تو دیکھ غافل سازو سامانِ بہار　　سرخیِ رنگِ رخِ گل کیا ہے؟ عنوانِ بہار
پتے پتے پر یدِ قدرت کے ہیں نقش و نگار　　برگ برگِ گل پہ ہے تحریر فرمانِ بہار
قافلہ در قافلہ ہے لالہ و گل کا ہجوم　　لعل اُگلے خاکِ گلشن نے یہ ہے شانِ بہار
کرمکِ شب تاب ہیں یا آج ہوا جگنو فروش　　اِن چراغوں سے منور ہے شبستانِ بہار
نغمہ زن بلبل کہیں کوئل کہیں قمری کہیں　　طائرانِ خوشنوا ہیں زمزمہ خوانِ بہار

لب پر آجاتی ہے غنچوں کے تبسم کی جھلک
چھیڑتی ہے جب شعاعِ مہرِ تابانِ بہار

ارتعاشِ عکسِ روئے خندۂ گل آب میں
ہے نگاہوں کیلئے آئینۂ شانِ بہار

خندۂ گل کی ادا ہے زینتِ روئے چمن
مسکراہٹ نیم وا کلیوں کی ہے جانِ بہار

ہو نہیں سکتی زرِ گل تک مجالِ دسترس
دستِ گلچیں کیلئے ہیں خار پیکانِ بہار

لوٹ لے صد جلوۂ حسنِ رُخِ گل لوٹ لے
دیدۂ نظارہ رہجائے نہ ارمانِ بہار

کیوں نہ اشعارِ شگفتہ میں بھی ہو رنگِ خزاں
برقؔ سا افسردہ دل جب ہو غزلخوانِ بہار

منظومہ جنوری ۱۹۲۶ء

جوشِ بہار

گھرا ہوا سرِ فلک جو ابرِ قطرہ بار ہے
خزاں پہ اوس پڑ گئی چمن چمن بہار ہے

گلوں کے روئے صاف پر کمال کا نکھار ہے
ورق ورق ہے خوشنما نظر نظر نثار ہے

جمی تھی برگ برگ پر جو گرد اب وہ دھل گئی
کلی کلی بکھر گئی۔ گرہ دلوں کی کھل گئی

نمو کا آشکار ہے بساطِ خاک سے نشاں
بچھا ہے فرشِ مخملی۔ گیاہِ نو سے ہے عیاں

اُگل رہی ہے لعل زمینِ باغِ بیگمان روش روش کھلے ہیں گل، چمن ہے کہکشاں

کلی ہے نیم وا کوئی دُلہن ہے یا حجاب میں

کھلا ہوا ہے نیم رُخ، ہے نیم رُخ نقاب میں

گرا رہا ہے بجلیاں، چنارِ شعلہ خو کہیں ضیا فگن ہے نیلوفر میانِ آبجو کہیں

ادائے زیبِ شاخ ہے گلِ شگفتہ رو کہیں بسی ہوئی ہے عطر میں صبائے مشکبو کہیں

بنا ہے تختۂ چمن مجسمہ بہار کا

شگفتگی کا دور ہے سماں ہے برگ و بار کا

برس رہی ہے تازگی، شجر بھی سبز پوش ہیں خزاں میں لٹ چکے تھے جو وہ آج گلفروش ہیں

بہار کا شباب ہے، یہاں عیش کوش ہیں نئی نئی مسرتیں لبوں میں تازہ جوش میں

رہینِ شغلِ مے کشی ہر ایک مے پرست ہے

سرور چیرہ دست ہے، خمار کو شکست ہے

بجائے خود ہر ایک گل ہے فردِ آب و تاب میں صفا جو نسترن میں ہے شگفتگی گلاب میں

ادائے دلفریب ہے، بنفشۂ خوش آب میں سمن ہے مست نشۂ جمالِ لاجواب میں

نگاہِ انتخاب کو عجیب قیل و قال ہے

شرف کسی پہ دے سکے جو ہر وہ بےمثال ہے

ہوا کی جنبشوں سے گل برس رہے ہیں پے بہ پے — شگوفہ ریز ہیں شجر کہ ڈھل رہے ہیں جام مے
سرور خیز کس قدر چمن کی ہے ہر ایک شئے — ترانۂ ہزار ہے مخجل کن نوائے نے
چٹک میں غنچے کی اثر صدائے جانفزا کا ہے
تبسم لطیف میں یہ شائبہ حیا کا ہے
کرشمۂ بہار ہے کہ نخل گلبدن بنے — یہ زینتیں نمو کی ہیں کھڑے ہیں سب دلہن بنے
یہ فیض برشگال ہے کہ خاک سے چمن بنے — یہ رحمت کریم ہے کہ غیرت عدن بنے
ضیا میں مثل برق ہے ادائے دلفریب گل
کہ جنت نگاہ ہے جمال و دیدہ زیب گل

منظومہ اپریل ۱۹۲۲ء

برسات اور مناظر کوہ

کیا شان دلفریب کہسار ہو بیاں — ہر دم یہاں ہے پیش نظر نت نیا سماں
برسات بھی دکھاتی ہے کیا ٹھنڈی گرمیاں — موسم میں ہیں غضب کی تلون مزاجیاں
سایہ کبھی ہے۔ دھوپ کبھی۔ ابر تر کبھی
دھندلا سا اک غبار ہے۔ پیش نظر کبھی

منظر وہ دلفریب سرِ کوہسار کا سایہ پھر اُس پہ دامنِ ابرِ بہار کا
وہ ہلکے ہلکے ابر سے پڑنا پھوار کا دامانِ دشت و کوہ سے دُھلنا غبار کا
بکھرے ہوئے وہ سبز شجر دُور دُور تک
آتے ہیں صاف صاف نظر دُور دُور تک

وہ نیلگوں سا گنبدِ گردوں کا سائباں ابرِ سپید مُحیط کہیں زیرِ آسماں
دلکش وہ سربلند پہاڑوں کی چوٹیاں پھرتے ہیں جن پہ ابر کے ٹکڑے رواں دواں
ٹھنڈی ہوائیں کھیلتی ہیں دُھوپ چھاؤں سے
دامانِ کوہ روندتے پھرتے ہیں پاؤں سے

برسات کا سماں وہ فضا سبزہ زار کی وہ دُور تک صفیں شجرِ سایہ دار کی
وہ رعد کی کڑک وہ صدا آبشار کی وہ موج ہائے سرد نسیمِ بہار کی
وہ جنبشِ صبا سے لہکنا گیاہ کا
وہ کامیاب ہو کے پلٹنا نگاہ کا

وہ ہلکی ہلکی دُھوپ وہ بادل کہیں کہیں قطعاتِ کوہسار مُسلسل کہیں کہیں
گھاٹی میں وہ بھرے ہوئے جل تھل کہیں کہیں سبزے کا فرش غیرتِ مخمل کہیں کہیں
پھیلا ہوا وہ سلسلۂ کوہ دُور تک
اور اُس پہ بادلوں کا وہ انبوہ دُور تک

وہ جلوۂ بہارِ شفق اور وقتِ شام — وہ دونوں وقت ملتے ہوئے شب کا اہتمام
وہ دامنِ اُفق سے نکل کر بہ احتشام — ہالے میں جلوہ ریز فلک پہ مہِ تمام
بکھری ہوئی وہ نور کی کرنیں زمین پہ
صد نقش دلفریب ہیں نیچر کے سین پہ

مطلع وہ صاف صاف وہ مہتاب جلوہ ریز — وہ ٹھنڈی روشنی وہ شعاعیں سرور خیز
تازہ کنِ دماغ ہوائیں وہ عطر بیز — فرحت فزائے قلب وہ پھولوں کی بوئے تیز
وہ نور سا برستا ہوا آسمان سے
کافور تیرگی کا وہ ہونا جہان سے

رخسارِ ماہتاب پہ گہہ دامنِ سحاب — وہ نورِ شب فروز کا جلوہ تہِ نقاب
گہہ کالے بادلوں سے جھلکنا بہ آب و تاب — گہہ ابرِ تر میں ڈوب کے ہونا غریقِ آب
ہونا جھلک دکھاتے ہی اوجھل نگاہ سے
منھ ڈھانکنا وہ دامنِ ابرِ سیاہ سے

مدھم سی زرد زرد شعاعیں وہ ماہ کی — جلوہ نما نقاب سے ابرِ سیاہ کی
وہ تیرگی میں جلوہ نمائی نگاہ کی — دامانِ ابر سے وہ جھلک گاہ گاہ کی
رخ پر ہوائیاں سی قمر کے چھٹی ہوئیں
وہ ابرِ تر کے ہاتھ بہاریں لٹی ہوئیں

وہ خال خال چرخ پہ تارے کہیں کہیں — وہ کالے بادلوں کے غبارے کہیں کہیں
وہ برق کی چمک وہ شرارے کہیں کہیں — وہ نور و تیرگی کے نظارے کہیں کہیں
منظر وہ آسماں پہ سپید و سیاہ کا
تھم تھم کے لطفِ دید اُٹھانا نگاہ کا

ہر رنگ میں بہار کے منظر ہیں دلفریب — جو سین ہیں یہاں وہ سراسر ہیں دلفریب
شام و سحر کے لطف برابر ہیں دلفریب — برسات کی فضائیں مقرر ہیں دلفریب
رنگینیاں جو کوہ پہ ہیں سبزہ زار کی
گلکاریاں ہیں قدرتِ پروردگار کی

منظومہ اکتوبر ۱۹۱۱ء

عروسِ کوہسار

یا

(ڈلیا کا پھول)

اے گلِ رنگیں ادا تصویرِ رعنائی ہے تو — دی ہے صنعت آفریں نے شانِ زیبائی تجھے
آنکھ کا تارا ہے چشمِ تماشائی ہے تو — حسنِ دلکش پہ ہے زیبا نازِ یکتائی تجھے

حسن کی تو ایک جیتی جاگتی تصویر ہے
چھینتی ہے دل ہمارا تیری ادائے دلفریب
شمعِ جاں افروز تیرا روئے پُر تنویر ہے
برقِ عارض پھونکتی ہے خرمنِ صبر و شکیب

شانِ رعنائی میں تو رکھتا نہیں اپنا جواب
رنگ تو بےمثل ہے افسوس بُو تجھ میں نہیں
یہ تو مانا پانی بھرتا ہے ترے آگے گلاب
حسنِ صورت ہے مگر اچھی سی خُو تجھ میں نہیں

پردۂ شب میں نکھرتا ہے ترا حسنِ شباب
زینتیں ہوتی ہیں چشمِ شوق سے پنہاں تری
لب پہ لب ہوتی ہے جب تجھ سے شعاعِ آفتاب
نُور کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں سب کلیاں تری

چھاؤں میں تاروں کی آتی ہے نسیمِ خوشگوار
نُور کے تڑکے جگانے تجھ کو خوابِ ناز سے
وار کرتی ہے تجھ پر گوہرِ شبنم نثار
مسکرا کر دیکھ لیتا ہے جو تُو انداز سے

تجھ کو اک تو حسن کی دولت ملی ہے بےقیاس
جامہ زیبی اُس پہ کرتی ہے دل آویزی فزوں
صاف کھلتا ہے ہر اک رنگ کا تجھ پر لباس
سُرخ، اُودا، زعفرانی، ارغوانی، نیلگوں

بھونرے ہوتے ہیں تصدق تجھ پہ فرطِ شوق سے　　ان سیہ مستوں کے حق میں چشمۂ شیریں ہے تُو
چوستے ہیں رس تری کلیوں کا کس کس ذوق سے　　گویا اک معشوقِ کمسن کا لبِ لعلیں ہے تُو

تجھ کو زیبا ہے اگر کہیے عروسِ کوہسار　　دیکھکر تجھکو بھڑک اُٹھتے ہیں جذباتِ لطیف
تیرے ہر ہر برگ سے ہے حسنِ قدرت آشکار　　روح پرور تیرا جلوہ ہے نباتاتِ لطیف

کیسے گُل بوٹے کیے پیدا خس و خاشاک سے　　صانعِ قدرت کی یاد آتی ہے صنعت دیکھکر
رازِ سربستہ ہیں یا ہر قوتِ ادراک سے　　برقِ حیرت میں ہوں اک اک گُل کی رنگت دیکھکر

منظومۂ ستمبر ۱۹۱۵ء

نیرنگِ ہستی

فریبِ چشمِ تماشا ہے جلوۂ ہستی　　نظر کے واسطے دھوکا ہے جلوۂ ہستی
کھلا کسی پہ نہیں کیا ہے جلوۂ ہستی　　جو حل نہ ہو وہ معمّا ہے جلوۂ ہستی

بُروں ہے فہمِ بشر سے یہ رازِ سربستہ
یہاں ہے طائرِ اوجِ خیال پر بستہ

رہینِ کشمکشِ انقلاب ہے عالم — ثبات یہ ہے کہ نقشے بر آب ہے عالم
نظر فریب، تماشائے خواب ہے عالم — طلسمِ وہم و گماں ہے، سراب ہے، عالم
حجابِ چشم ہے یہ ہست و بود کچھ بھی نہیں
ہے ماسوا کی نمائش وجود کچھ بھی نہیں

ازل سے وقفِ تغیر نظامِ ہستی ہے — جو پائمالِ حوادث ہے یہ وہ بستی ہے
جہاں میں لازم و ملزوم اوج و پستی ہے — کہیں خوشی ہے اداسی کہیں برستی ہے
ثباتِ دہر کا ہے رنگ اشکِ شبنم میں
ہیں انقلاب کے ذرّے ہوائے عالم میں

کوئی ہے شاہِ زماں تنگدست ہے کوئی — کسی کا مرتبہ بالا ہے پست ہے کوئی
کسی کو نشۂ زر، فاقہ مست ہے کوئی — کسی کو خونِ جگر، مے پرست ہے کوئی
کسی کے حکم پہ خم گردنیں خدائی کی
کسی کو رنج سے فرصت نہیں ہائی کی

کسی کو جامِ مئے لعلگوں میسّر ہے — کسی کو دیدۂ پرخوں بجائے ساغر ہے
کسی کو بارِ نزاکت سے چین بستر ہے — کسی کو سنگِ گراں بہرِ بالشِ سر ہے
کسی کی لاش پہ پُر زر پڑے دوشالے ہیں
کسی کو خیر سے دو گز کفن کے لالے ہیں

کسی کے سر پہ تصدق ہو تاجِ سلطانی — نصیب ہے کسی کمبخت کو نگسرانی
کسی کے زیبِ بدن خرقۂ زمستانی — کسی کے جسم کی پوشش ہے تن کی عُریانی
کسی کو بھیک بھی مانگے کہیں نہیں ملتی
جگہ مزار کو زیرِ زمیں نہیں ملتی

یہ اپنے اپنے مقدر کی بات ہوتی ہے — کہیں خوشی کی کہیں غم کی رات ہوتی ہے
ہر ایک بات یہاں بے ثبات ہوتی ہے — کسی کے پھول کسی کی برات ہوتی ہے
کسی کو دستِ اجل سے اماں نہیں ملتی
حیات ملتی ہے پر جاوداں نہیں ملتی

بشر کو چاہیے انجام پر نظر رکھے — اسی میں خیر ہے دلمیں نہ فکرِ شر رکھے
جہان منزلِ عبرت ہے چشمِ تر رکھے — یہاں ہر ایک قدم پھونک پھونک کر رکھے
تماشا گاہِ زمانہ کی سیر بھی کر لے
جو ہو سکے تو کوئی کارِ خیر بھی کر لے

(منظومہ جون سنہ ۱۹۱۱ء)

نالۂ بیوہ!

اُف یہ سوزِ بیوگی اور یہ شبِ تارِ الم — اُف یہ دردِ جاں ستاں اور میں گرفتارِ الم
اُف یہ عہدِ نوجوانی اور یہ بارِ الم — اُف یہ نازک دل مرا اور کاوشِ خارِ الم

اس جہاں میں وقفِ بربادی تھی کیا ناشاد میں
کمسنی میں مجرمِ شادی تھی کیا ناشاد میں

میری قسمت سے نہیں چرخِ بریں کو اتفاق — آفتِ جانِ حزیں ہے صدمۂ دردِ فراق
ماتمِ شوہر کا صدمہ کیوں نہ گزرے دل پہ شاق — وہ مری آنکھوں سے اوجھل میں سراپا اشتیاق

ہجر میں ہوتا ہے تکیہ آرزوئے دید پر
صبر آئے مجھ سی قسمت کو کس اُمید پر

دل ملا تھا کیا مجھے بیتاب ہونے کے لئے — میں نے کیا جانِ حزیں پائی تھی کھونے کیلئے
کیا مجھے آنکھیں ملی تھیں غم میں رونے کے لئے — کیا مری تقدیر بھی جاگی تھی سونے کیلئے

دورِ غم اول سے تا آخر رہے افسوس ہے
ناشگفتہ غنچۂ خاطر رہے افسوس ہے

شرم دامنگیر ہے دل بھر کے رو سکتی نہیں — آنسوؤں سے اپنے دل کے داغ دھو سکتی نہیں

بیکس و بے دست و پا ہوں جان کھو سکتی نہیں　　باعثِ تسکین کوئی تدبیر ہو سکتی نہیں

صدمۂ دردِ فراق و رنج سہنے کے لیے

میں کہاں سے لاؤں دل ناشاد رہنے کے لیے

شمعِ سوزاں ایک شب ہے تیرے جلنے کیلئے　　اور میں آٹھوں پہر غم سے پگھلنے کیلئے

مشغلہ کوئی نہیں دل کے بہلنے کیلئے　　رات دن ہوں میں کفِ افسوس ملنے کیلئے

روز اک تازہ ستم ہے خاطرِ ناشاد پر

تُل رہا ہے آسمانِ فتنہ گر بیداد پر

بُجھ گیا بادِ حوادث سے چراغِ آرزو　　ہو گیا وقفِ خزاں سرسبز باغِ آرزو

مٹ چکا اک لوحِ دل سے نقشِ داغِ آرزو　　خونِ حسرت سے لبالب ہے ایاغِ آرزو

شمعِ کُشتہ ہوں مری افسردگی جاتی نہیں

غنچۂ دل کیا کِھلے پژمردگی جاتی نہیں

چارہ سازِ زخمِ دل ہو کون مجھ ناشاد کا　　کون ہے درد آشنا مجھ خانماں برباد کا

کس سے میں شکوہ کروں چرخِ ستم ایجاد کا　　کان دھر کر سننے والا کون ہے فریاد کا

سوزِ غم سے جل کے مثلِ شمع رو لیتی ہوں میں

اشکِ حسرت سے جگر کے داغ دھو لیتی ہوں میں

پھونک دے اے نالۂ آتش فشاں تو ہی مجھے　　غرق کر دے جوششِ اشکِ رواں تو ہی مجھے
خاک کر دے خاک اے برقِ طپاں تو ہی مجھے　　لوحِ ہستی سے مٹا دے آسماں تو ہی مجھے

دم نکل جائے تو قیدِ غم سے آزادی ملے
نالۂ جاں سوز سے ماتم سے آزادی ملے

منظومہ اپریل ۱۹۰۸ء

یتیموں کی فریاد

آوارۂ جہاں ہیں برباد خانماں ہیں　　بیزار زندگی ہیں قسمت کے نوحہ خواں ہیں
ہم سر سے پاؤں تک ہیں اک نقشِ نامرادی　　تصویرِ بیکسی ہیں رودادِ بیکساں ہیں
ہے یاس کا مرقع حالِ زبوں ہمارا　　ہم نالۂ مجسم سر تا بہ پا فغاں ہیں
بسمل ہیں تیغِ غم سے دلخستہ ہیں الم سے　　نخچیرِ زخم خوردہ، صیدِ شکستہ جاں ہیں
ہر دل پہ بار ہیں ہم نظروں میں خار ہیں ہم　　افتادۂ زمیں ہیں مردودِ آسماں ہیں
خانہ بدوش ہیں ہم حسرت فروش ہیں ہم　　گم کردہ راہبر ہیں گم گشتہ کارواں ہیں
غم سے شکستہ دل ہیں صدموں سے مضمحل ہیں　　نالوں سے جاں بلب ہیں فاقوں سے نیم جاں ہیں
دنیا میں کس مپرسی ہے میزباں اپنی　　بزمِ جہاں میں گویا ناخواندہ میہماں ہیں

سائے سے ہم پدر کے محروم ہیں سراسر　　جس گود میں پلے تھے اُسکے ہی نوحہ خواں ہیں
نظروں سے گر چکے ہیں مانندِ اشکِ حسرت　　کون آنکھ اُٹھا کے دیکھے ہر سُو الم رواں ہیں
کانوں پہ ہاتھ رکھکر سُنتا ہے جس کو عالم　　وہ درد کا بیاں ہیں، وہ غم کی داستاں ہیں
دامن کشاں ہیں ہم سے بیگانے اور یگانے　　بیکس یتیم ہیں ہم محتاجِ آب و ناں ہیں
پُرسانِ حال کوئی اپنا نہیں جہاں میں　　ہیں وقفِ کس مپرسی، وہ جنسِ رائگاں ہیں

غربت نصیب ہیں ہم خود اپنے ہی وطن میں
جلجائیں شاخ پر جو، وہ پھول ہیں چمن میں

پھولوں میں تُلنے والے سُن لیں ہمارے نالے　　ہاتھوں سے لیکن اپنے دلکو رہیں سنبھالے
فریادِ غمزدوں کی دل توڑ کر رہے گی　　بیفائدہ نہ پھوٹینگے اپنے دل کے چھالے
کوئی سُنے تو غم کی ہم داستاں سُنائیں　　دل چیر کر دکھائیں اتنک ہیں زخم آلے
صورت یہ کہہ رہی ہے حرماں نصیب ہیں ہم　　دیکھیں ہماری حالت احساس رکھنے والے
سردی کی رات کاٹیں ہم آہِ سرد بھر کر　　سوتے رہیں سحر تک وہ اوڑھکر دوشالے
فاقوں سے دن گزاریں ہم نیم جاں تڑپ کر　　تن پروری کریں وہ کھا کھا کے تر نوالے
تن ڈھانکنے کو ہم کو کپڑا نہ ہو میسّر　　پوشاک کے ہوں اُنکی فیشن نئے نرالے
غم سے کیا کریں ہم رو رو کے لال آنکھیں　　اُن کے مئے طرب سے لبریز ہوں پیالے

پہنچے کوئی تو یارب فریاد کو ہماری
بھر آئے دل کسی کا سنکر ہمارے نالے
کوئی تو ہم کو اپنی آغوش میں جگہ دے
کوئی تو اپنا سایہ ہم بیکسوں پہ ڈالے
در در کی ٹھوکریں ہم کھایا کرینگے کبتک
کبتک پڑے رہینگے ہم بیکسی کے پالے
آوارہ کو بکو ہیں ریگِ رواں کی صورت
مٹی میں مل رہے ہیں معصوم بھولے بھالے
کوئی ثواب لے لے دلخستگانِ غم کا
امداد کا ہماری بیڑا کوئی اُٹھا لے

فریاد پر ہماری جو آج کان دے گا
معصوم بیکسوں کی لاکھوں دعائیں لے گا

منظومہ جنوری ۱۹۲۱ء

اچھوتوں سے نفرت فضول ہے

سب کیلئے ہی یکساں قدرت کا فیض جاری
مفلس ہو یا تونگر راجہ ہو یا بھکاری
ٹوٹی سی جھونپڑی ہو یا قصر کا مگاری
دونوں پہ مہرِ انور کرتا ہے جلوہ باری

ہیں خاک بوس کرنیں مہتابِ ضو فشاں کی
ہر گھر میں روشنی ہے قندیلِ آسماں کی

سیراب سب کو یکسر کرتا ہے آبِ باراں
تختہ ہو زعفراں کا یا کشتِ خشکِ دہقاں

جوش بہار کا ہے یکساں اثر نمایاں ہو گلبنِ گلستاں یا لالۂ بیاباں
تاثیرِ فصل سے ہے سود و زیاں برابر
ہیں نخلِ دشت و گلشن وقفِ خزاں برابر

عصیاں شعار ہے یا کوئی مہاتما ہے خاکی لباس دونوں کو ایک سا ملا ہے
شاہنشہِ جہاں ہے یا کوئی بے نوا ہے جس کو بقا ملی آخر اسے فنا ہے
فطرت کا سب پہ حاوی قانون ایک ہی ہے
عنواں گو جدا ہیں مضمون ایک ہی ہے

پست و بلند کا ہے پھر امتیاز کیسا ادنٰی کی رمز کیا ہے اعلٰی کا راز کیسا
سائے سے بیکسوں کے یہ احتراز کیسا پتلوں کو خاک کے ہے ہستی پہ ناز کیسا
کیفِ مئے خودی سے ہے وہم برتری کا
حاصل ہے ورنہ سب کو رتبہ برابری کا

تفریق جو ہے قائم یہ غیر قدرتی ہے اسفل بھی آدمی ہے افضل بھی آدمی ہے
دُور از رہِ حقیقت یہ فرقِ ظاہری ہے ہر قصرِ تن میں روشن اک شمعِ زندگی ہے
جلوے ہیں سب اسی کے رازِ حیات کیا ہے
ہیں پھول اک چمن کے تخصیصِ ذات کیا ہے

مثلِ حباب کب ہے لازم ہوا میں بھرنا بحرِ جہاں میں سب کو اک گھاٹ ہے اُترنا
زیبا نہیں کسی سے بیجا سُلوک کرنا مُنھ سے اچھوت کہنا نفرت سے نام دھرنا

تذلیل دُوسروں کی تحقیر ہے خود اپنی
اپنوں کو غیر کہنا تشہیر ہے خود اپنی

جو اِن کا مُستقر ہے وہ ہے وطن ہمارا ہے وجہِ ناز ان کو دَورِ کُہن ہمارا
تہذیب ایک سی ہے یکساں چلن ہمارا بیگانہ ان کو سمجھیں دیوانہ پن ہمارا

اِس خاک کے ہیں پُتلے بھارت سپُوت ہیں سب
گر یہ اچھُوت ہیں تو ہم بھی اچھوت ہیں سب

منظومۂ جنوری ۱۹۲۵ء

فسانۂ بہار

ہر گُل ہے نقش بستہ ترانہ بہار کا لکھّا ہے ہر ورق پہ فسانہ بہار کا
پھُولی ہے عکسِ سبزہ و گل سے شفق نئی ہر آبجو ہے آئینہ خانہ بہار کا
پیکاں ہیں غنچے، ناوکِ دلکش ہے شاخِ گُل اب کیا خطا کرے گا نشانہ بہار کا
کیوں رندِ بادہ نوش نہ دل کھول کر پئیں ہاتھ آگیا ہے خوب بہانہ بہار کا

ہے شورِ موجِ آب میں سازِ طرب کا رنگ — غنچوں کی ہے چٹک میں ترانہ بہار کا
سرسوں کے کھیت بن گئے کیسر کی کیاریاں — گویا بسنت رت ہے زمانہ بہار کا
گلچیں نے پھول توڑ کے دامن میں بھر لیئے — لوٹا ہے سنگدل نے خزانہ بہار کا
گلزار میں ہے غنچہ و گل پر گہر فشاں — شبنم لٹا رہی ہے خزانہ بہار کا
بیتاب کیوں قفس میں نہ ہو بلبلِ اسیر — یہ جوشِ فصلِ گل یہ زمانہ بہار کا
گیسو عروسِ گل کے سنوارے نہ کس لیئے — موجِ نسیمِ صبح ہے شانہ بہار کا
غافل یہ رنگ دیکھتی آنکھوں سے دیکھ لے — یاد آئیگا خزاں میں زمانہ بہار کا

آمادۂ وداع ہے دورِ شباب برقؔ
گلشن سے قافلہ ہے روانہ بہار کا

منظومہ فروری ۱۹۲۹ء

رنگینی بسنت

پہن کے پھولوں کا زیور بسنت آئی ہے — نگاہیں لوٹ رہیں جسپر وہ خوش ادائی ہے
بہارِ حسن میں تاثیرِ جانفزائی ہے — شگفتگی سی فسردہ دلوں نے پائی ہے
عروسِ گل کا چمن میں سنگار دیکھیں گے
بہار دیکھنے والے بہار دیکھیں گے

فضا بدل گئی سرسوں بہار پہ آئی　　نہا کے ابر کے چھینٹوں سے یہ نکھر آئی
خزاں کا دور گیا۔ تازگی نظر آئی　　شجر نہال ہیں۔ دل کی مراد بر آئی

کھلے ہیں غنچۂ وابستہ خندہ زن ہو کر
بسنت آئی ہے زینتِ دہِ چمن ہو کر

شگوفہ کاریِ فطرت کا ہر طرف ہے ظہور　　شگفتگی سے چمن زار دہر ہے معمور
وفورِ جلوۂ گل سے برس رہا ہے یہ نور　　نگاہیں کیف میں ڈوبی ہیں، دل ہیں مست و سرور

کلی کلی گرہِ رنگ و بو ہے گلشن میں
بسنت رت میں یہ شانِ نمو ہے گلشن میں

کنول کے پھول ہیں زینت فزائے چادرِ آب　　بنے ہیں دیدۂ مشتاق بہرِ دیدِ حباب
نظر نواز ہے گلشن میں رنگِ روئے گلاب　　نثار ہے گلِ صد برگ پر بہارِ شباب

کرشمے حسنِ نباتات کے نرالے ہیں
مزے بہار کے لوٹیں جو آنکھ والے ہیں

نظارہ کشتِ دو چمن کا ہے انبساط انگیز　　بسنت رت کی ہیں رنگینیاں طراوت خیز
نشاط پرور نہ ہو کیوں شمیمِ عنبر بیز　　ہے موجِ بادِ بہاری سے آتشِ گل تیز

ترانہ ریزیِ بلبل سے وجد طاری ہے
یہ برقِ حسنِ محبت کی سحر کاری ہے

منظومہ فروری ۱۹۲۹ء

رضاکار

یا

والنٹیرز

خدمتِ خلق کا جذبہ ہے رضاکاروں میں　　یہ ہیں بہبودِ خلائق کے طلبگاروں میں
وردیاں پہنے کھڑے رہتے ہیں بازاروں میں　　کہ محافظ ہیں یہی امن کے تہواروں میں

بے غرض فرض ادا کرتے ہیں کس خوبی سے
سکّہ اپنا یہ جماتے ہیں خوش اسلوبی سے

کیسے شائستہ سپاہی ہیں یہ قومی جانباز　　خادمِ ملک ہیں یہ ملک کے ہیں سچے دمساز
بھرے مجمع کیلئے حکم ہے ان کی آواز　　حسنِ تدبیر کا ان کے ہے نرالا انداز

کام انگلی کے اشارے سے لیا کرتے ہیں
جانفشانی سے ادا فرض کیا کرتے ہیں

ان میں ایثار کی تصویر نظر آتی ہے　　نورِ تہذیب کی تنویر نظر آتی ہے
قوم کے درد کی تاثیر نظر آتی ہے　　کششِ قوتِ تسخیر نظر آتی ہے

کوردر کور گزرتے ہیں جو بازاروں سے
گنبدِ چرخ بھی گونج اُٹھتا ہے جیکاروں سے

کوئی میلہ ہو، تماشا ہو کہ گنگا اشنان — اُتسب ہو کوئی جلسہ ہو بساز و سامان
کانگریس کیمپ میں یا جلوہ فگن ہوں مہمان — پردیشن ہو کہ آرہے کوئی لیڈر ذیشان

ہر جگہ ان کے پرے ہمکو نظر آتے ہیں
بسرو چشم یہ خدمات بجا لاتے ہیں

انتظام اُن کا ہے سرکار و رعایا کو پسند — یہ قواعد کے ہیں قانون کے پورے پابند
ذات سے انکی کسی کو بھی نہیں خوفِ گزند — حسنِ اخلاق سے رکھتے ہیں یہ سبکو خرسند

کام کرتے ہیں سرانجام ادا دانی سے
کہ یہ پبلک کو بچاتے ہیں پریشانی سے

دھوپ میں اپنی جگہ پر یہ کھڑے رہتے ہیں — رات کو ڈیرہ جمائے یہ پڑے رہتے ہیں
جھنڈے انکے سر بازار گڑے رہتے ہیں — کیسی نازک ہو پوزیشن یہ اڑے رہتے ہیں

خللِ اندازِ سکوں ہو کوئی کیا ممکن ہے
ان کے ہوتے کہیں شورش ہو یہ ناممکن ہے

آگ لگ جائے تو فی الفور بجھا دیتے ہیں — جان پر کھیل کے خطرے کو مٹا دیتے ہیں

گم شدہ چیز کو یہ ڈھونڈ کے لا دیتے ہیں بھولے بھٹکوں کو ٹھکانے کا پتا دیتے ہیں

خضرِ منزل بھی ہیں یہ پیکِ سبک گام بھی ہیں

خادمِ فیض رساں بندۂ بے دام بھی ہیں

اوّلیں فرض سمجھتے ہیں یہ قومی خدمت دوسروں کیلئے سر لیتے ہیں رنج و کلفت

بے غرض کام کی ہے انکی نظر میں عظمت نہ تمنائے ستائش نہ صلے کی حسرت

خدمتِ خلق یہ مائل نہیں پابندی سے

کام کرتے ہیں رضا کار رضا مندی سے

منظومہ جولائی ۱۹۲۴ء

دان ویر کرن

ارجن کے جو بانوں سے چھدا قلب و جگر ہے صد زخم رسیدہ کرنِ سینہ سپر ہے

غرقاب لہو میں ہے بدن خاک بسر ہے الجھا سر دامانِ مژہ تارِ نظر ہے

نخچیرِ زبوں حال کا دم ٹوٹ رہا ہے

ہر زخم سے فوارۂ خوں چھوٹ رہا ہے

حالت تھی ادھر نزع کی دل خستہ یہ طاری گنتی کے تھے کچھ سانس تنِ زار پہ بھاری

اتنے ہی میں نازل ہوئے دو پریم بھکاری　　ارجن تھا اک اِس بھیس میں اک کرشن مُراری
دونوں نے رمائی تھی بھبوت اپنے بدن میں
یہ دیکھنا تھا کتنی سخاوت ہے کرن میں
دی بڑھ کے فقیروں نے صدا ہے کوئی دانی　　جو درد رسیدوں کی سُنے رام کہانی
دو روز سے بھوکے ہیں نہ دانہ ہے نہ پانی　　اس دم یہ بنی جاتی ہے بیکل ہیں پرانی
اندھیر ہے اس نگر میں داتا نہیں ملتا
دے ہاتھ اُٹھا کر کوئی ایسا نہیں ملتا
اے ویر کرن تیری سخاوت کا ہے شُہرہ　　جُرأت کا دھنی تو ہے شجاعت کا ہی شُہرہ
بھنڈارا ہے بھرپور۔ امارت کا ہے شُہرہ　　تو مرد سخی ہے تری ہمت کا ہے شُہرہ
سُنتے ہیں کہ مایوس سوالی نہیں جاتا
جو سامنے آئے ترے خالی نہیں جاتا
افسوس کہ تو رَن میں سرِ خاک پڑا ہے　　زخموں سے بدن چُور ہے کیا وقت کڑا ہے
اب اور کہاں جائیں ہمیں شوک بڑا ہے　　کیا جانے نصیب اپنا کہاں آج لڑا ہے
نراس ہیں در اور دکھائی نہیں دیتا
بھکشا کا کوئی طور دکھائی نہیں دیتا

کانوں میں کرن کے گئی آوازِ المناک — اک آہ بھری درد سے دیکھا سوئے افلاک
ملبوس ٹٹولا تو نہ تھا پاس بجز خاک — زخمی کا ہوا تیرِ ندامت سے جگر چاک

بولا کہ میں خود بحرِ عدم کے ہوں کنارے
لیجاؤ مرے شستر جو کام آئیں تمہارے

بولے وہ گدا سُن کے یہ الفاظِ غم آمیز — سادھو ہیں ہمیں شستر کے چھونے سے ہے پرہیز
سنتوں کے ہیں کس کام کے یہ ناوکِ خونریز — دے دان ہمیں پیٹ کی اگنی ہے بہت تیز

کچھ پاس نہیں تیرے تو ہم جاتے ہیں داتا
مایوس ہیں با دیدۂ نم جاتے ہیں داتا

اس بات کے سُننے کی تھی کب تاب کرن کو — دل تھام کے بولا کہ کہاں جاتے ہو ٹھہرو
یہ سامنے پتھر جو پڑا ہے یہ اٹھا دو — خالی تمہیں جانے نہیں دوں گا ابھی دم لو

سونے کی مرے دانت میں اک کیل جڑی ہے
لیجاؤ وہی تم کہ مصیبت کی گھڑی ہے

سُن کر یہ بچن بولے وہ درویش بگڑ کر — ہم سنگدل ایسے ہیں اُٹھادیں تجھے پتھر
تُڑوائیں ترا دانت بھی یہ پاپ لیں سر پر — اس دان سے نردان ہی رہنا ہمیں بہتر

دینا ہے تو خود توڑ کے دے ہاتھ سے ہم کو
کر تو ہی دراز اپنے ذرا دستِ کرم کو

یہ سُنکے پھڑکنے لگا وہ زخمیِ دل تنگ سو کروٹیں لیتا ہوا جا پہنچا وہ تا سنگ
یوں توڑ دیا دانت کہ سادھو بھی ہُوئے دنگ اب ان کے لینے میں مگر لائے نیا رنگ

فرمایا کہ یہ دانت ترا خون میں تر ہے
کر پاک اسے جل سے جو دینے کی نظر ہے

یہ سُنکے نہ زخمی کو رہا ضبط کا یارا ہمت نے دیا نزع کے عالم میں سہارا
دانتوں سے کماں کھینچ کے اک بان جو مارا دھرتی سے نکل آئی وہیں گنگ کی دھارا

دُھل کر جو چمکنے لگا آلودۂ خوں دانت
تھا آب میں اب گوہرِ یکتا سے فزوں دانت

یہ دیکھ کے بھیس اپنے فقیروں نے اُتارے حل ہو گئے جو عقدۂ دشوار تھے سارے
کہنے لگے بھر پائے ہوئے آج ہمارے صد شکر کہ اچھی جگہ ہاتھ ہمنے پسارے

یکتا ہے کرن تو، ترا ثانی نہیں دیکھا
سنسار میں تجھ سا کوئی دانی نہیں دیکھا

(منظومہ اگست ۱۹۲۸ء)

کرشن سداما

سداما جی بسر کرتے تھے بیحد تنگدستی سے — بیشتر تلخ کامی تھی خمارِ فاقہ مستی سے
ہوئی تھی زندگی دشوار گرم و سردِ ہستی سے — یہ عسرت تھی کہ کوسوں دور تھے عشرت پرستی سے

تہی دستی سے دو دو وقت کے فاقے گزرتے تھے
مگر لب آشنائے شکوۂ قسمت نہ کرتے تھے

رضا پرور تھے یکساں جانتے تھے رنج و راحت کو — سمجھتے تھے بہ دورِ عیش ایامِ مصیبت کو
شعار اپنا بنا رکھا تھا تسلیم و قناعت کو — جگہ دل میں نہ دیتے تھے خیالِ مال و دولت کو

شگفتہ دورِ غم میں خاطرِ ناشاد رکھتے تھے
حریمِ دل خیالِ یار سے آباد رکھتے تھے

گرہ میں علم کی دولت تھی لیکن ہاتھ تھے خالی — خیالِ مفلسی تھا پست پیشِ ہمتِ عالی
کبھی خاطر میں لاتے تھے نہ یہ پچی زدہ حالی — نہایت شاق تھی دلبر مگر بچوں کی پامالی

نظر جس وقت کمھلائے ہوئے پھولوں پہ پڑتی تھی
طبیعت زلفِ خوباں کی طرح بن کر بگڑتی تھی

بڑھا جب اک قسمت کی طرح افلاس کا عالم — تو حالت ہیچ سامانی سے روز افزوں ہوئی برہم

جو گزرے اس طرح بے آب و دانہ تین دن پیہم　　سوشیلا نے پتی سے یُوں کہا با دیدۂ پُرنم

بچھونا ہے نہ بستر ہے نہ پردہ ہے نہ چادر ہے
نہ ہی بیٹھک کی جگہ ہے نہ مکاں گھر ہے

اُنہیں بستر سپیٹ کو روٹی نہ تن پر تار باقی ہے
بس اک تارِ نفس ہے اور جانِ زار باقی ہے

کہاں تک نت نئی آفت سہیں تازہ ستم دیکھیں　　کہاں تک جان پر صدمے اُٹھائیں رنج و غم دیکھیں
کہاں تک تھام کر دل توڑتے بچوں کو دم دیکھیں　　تڑپنا آہ ! معصوموں کا کن آنکھوں سے ہم دیکھیں

مٹائیں پیٹ دن بھرنے کی جھوٹی آس ہم کب تک
بجھائیں اوس کے چھینٹوں سے آخر پیاس ہم کب تک

سفر کی ٹھان کر گھر سے نکالو تم قدم باہر　　اگر روزی ملے تو دیس سے پردیس ہے بہتر
گزاریں گے کسی صورت یہاں گزرے گی جو ہم پر　　شرن لو تم شری بھگوان کی اب دوارکا جا کر

نگاہِ مہر سے اُن کی ستارا اپنا چمکے گا
نصیبہ پرتوِ رُخ سے دوبارا اپنا چمکے گا

سُداما نے کہا میں بات اپنی کھو نہیں سکتا　　پرائے در پہ دستک دوں یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا
کسی کے سامنے میں اپنا دُکھڑا رو نہیں سکتا　　بہا کر اشکِ حسرت داغِ قسمت دھو نہیں سکتا

نہ دیگا آن بن کیا پیدا کیئے کی لاج ہے جس کو
اُسی کا آسرا ہے مُنھ دکھاؤں اور اب کس کو

رسائی کرشن کے دربار تک ہی کیا کوئی آساں کہاں تاریک ذرہ اور کہاں وہ نیّرِ تاباں
ہوئی گر باریابی کون ہوگا حال کا پُرساں وہ پہچانیں گے کیا روئے گدائے بے سروساماں
وہ راجہ ہیں ملیں گی کب انہیں تو اس سے فرصت
نہ ہوگی ستیہ بھاما۔ رُکمنی کے پاس سے فرصت
سوشیلا نے کہا کیا کرشن جی آنکھیں چرائینگے نہیں ہرگز نہیں وہ رسمِ ہم چشمی نبھائیں گے
نگاہیں چار ہوتے ہی تمہیں پہچان جائینگے بہا کر پریم کے آنسو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے
وہ راجہ ہو گئے تو کیا نئے ہیں یا نویلے ہیں
پُرانے متر ہیں بچپن کے برسوں ساتھ کھیلے ہیں
سُداما جی کے دل میں گر گئیں گھر کچھ تو یہ باتیں اُدھر کچھ یاد آئیں عہدِ طفلی کی ملاقاتیں
گروکل کے وہ دن وہ اکتسابِ علم کی راتیں وہ جذباتِ محبت اور آپس کی مداراتیں
رہا قابو نہ دل پر ہو گئے تیار چلنے کو
بہانہ خوب یہ ہاتھ آ گیا گھر سے نکلنے کو
خیال آیا اگر جاؤں تو خالی ہاتھ کیا جاؤں پرانے متر سے ملنے بلا سوغات کیا جاؤں
پئے تجدیدِ اُلفت مَوردِ آفات کیا جاؤں بحالِ زار کیا جاؤں بایں اوقات کیا جاؤں
نہوں تحفے تحائف ہدیۂ ناچیز کافی ہے
سمجھ لینگے وہ برسوں بعد ملنے کی تلافی ہے

سوشیلا نے پتی کی اپنے جب یہ آرزو پائی — تو دل ڈوبا فزوں بیکسی سے آنکھ بھر آئی
گئی ہمسایہ میں تھوڑے سے چاول مانگ کر لائی — برائے شیام سندر پریم کی سوغات بھجوائی

سُداما باندھ کر پلّے میں چاول دوارکا پہنچے
درِ مقصود تک منزل بمنزل چلکے جا پہنچے

کہا دربان سے کہدو کہ اک ناکام آیا ہے — مجسّم حسرتِ دیدِ رخِ گھنشیام آیا ہے
پرستارِ قدیمی بندۂ بیدام آیا ہے — برہمن دور افتادہ سُداما نام آیا ہے

محل تک دوارپالوں نے پیامِ دید پہنچایا
بیانِ شوق تا جلوہ گہہ اُمّید پہنچایا

سُنا جب لکشمی پت نے تو ہو کر بیقرار اُٹھے — طلائی تخت سے چشمِ سراپا انتظار اُٹھے
رہی چوسر کے پانسوں کی نہ سدھ بے اختیار اُٹھے — فدا ہونے کو روئے یار پر پروانہ وار اُٹھے

جھپکتے ہی پلک سیرابِ نظّارہ نگاہیں تھیں
سُداما کے گلے کا ہار موہن کی باہیں تھیں

بمنّت ساتھ لیجا کر بٹھایا تختِ زرّیں پر — اُتاری آرتی صدقے کیئے لعل و زر و گوہر
یہ عالم تھا کہ مصروفِ پرستش تھے دیا ساگر — کیا سمّان آدر دیوتاؤں سے کہیں بڑھکر

زہے بختِ رسا یہ مرتبہ پایا سُداما نے
چنور ان پہ ڈُلایا رکمنی اور ستیہ بھاما نے

بصد شوق و تمنّا پھر یہ پوچھا دین بندھو نے — کہاں ہے وہ؟ ہمیں بھاوج نے جو سوغات بھیجی ہے
بہت ہی مان کا اک پان ہم ہیں پریم کے بھوکے — حجاب اتنا عبث آتا ہے اُسکے پیش کرنے سے
وہ ہدیہ سر پہ رکھ لینے کے ہم قابل سمجھتے ہیں
اسے تو ہم حسابِ دوستاں دردل سمجھتے ہیں
بڑھایا تحفۂ اُلفت کی جانب ہاتھ پھر اپنا — سر آنکھوں پر ادب سے ارمغانِ شوق کو رکھا
کیا جب نوشِ جاں تو خوانِ نعمت سے سوا پایا — لبِ شیریں سے فرطِ ذوق میں بیساختہ نکلا
بھری ہے کوٹ کر لذّت جوان نایاب دھانوں میں
مزا ایسا نہ پایا آج تک جنّت کے کھانوں میں
کئی دن تک سُداما نے بسر کی میہمانی میں — شبانہ روز گزرے لطف و عیش و کامرانی میں
رہے خنداں و شاداں دوارکا کی راجدھانی میں — بہارِ جنّت الفردوس دیکھی زندگانی میں
ہوئے پھر بادلِ ناخواستہ دربار سے رخصت
کیا مُرلی منوہر نے بڑے اکرام سے رخصت
وطن پہنچے جو طے کر کے منازل ہو گئے حیراں — نظر آیا نیا نقشہ نیا جلوہ نیا ساماں
نہ وہ گھر ہے نہ وہ در ہے نہ ہے وہ خانۂ ویراں — جہاں ٹوٹا سا چھپّر تھا کھڑا ہے قصرِ عالیشاں
ہوئی حیرت یہ بیداری ہے یا ہے خواب کا عالم
نظر آتا ہے بدلا عالمِ اسباب کا عالم

سوشیلا کی نگاہیں لگ رہی تھیں دیرسے در پہ　　جو دیکھا اپنے سوامی کو رکھی خاکِ قدم سر پہ
لٹائیں وار کر موتی کی لڑیاں رُوئے انور پہ　　محل میں ساتھ لیجا کر بٹھایا مسندِ زر پہ

کہا پھر دست بستہ ہم نے دھن اتنا جو پایا ہے
شری بھگوان کا پرتاپ ہے یہ ان کی مایا ہے

منظومہ اگست ۱۹۲۳ء

فلسفۂ گیتا

ارجن کا جو رتھ قلب میں لشکر کے در آیا　　صفہائے مقابل کا نظارہ نظر آیا
دیکھا جسے اپنا تھا۔ نہ تھا کوئی پرایا　　بیساختہ دل دردِ محبت سے بھر آیا

جی چھوٹ گیا آ گیا رعشہ سا بدن میں
تھرایا دھنش بان کفِ شیر فگن میں

بھگوان سے کی عرض کہ اسے واقفِ اسرار　　ہنگامۂ خونریز سے دل میرا ہے بیزار
کس کو ہدفِ تیر کروں کس پہ کروں وار　　یہ مقتلِ احباب ہے یا عرصۂ پیکار؟

تیغ آزما بھیشم سے ہوں رزمیں کہ گرو سے
میدان کو سیراب کروں کس کے لہو سے

کیا رزم میں یہ بھی ہے کوئی کارِ نمایاں　　شمشیر ہو آلودۂ خونابِ عزیزاں
دل پر ہے گراں خوفِ گرانباریِ عصیاں　　ہے قلبِ طپاں عاقبتِ کار سے لرزاں

بے تابِ تواں کشتۂ صد ناوکِ غم ہوں
ہمشکلِ کماں ہوں ہمہ تن شرم سے خم ہوں

برپا کروں کس دن کیلئے رزم میں قیامت　　مال و زرِ دُنیا نہیں سرمایۂ جنّت
جو خون بہا کر ملے - ہے خاکِ مذلت　　اِس تخت پہ - اس تاج پہ - اس راج پہ لعنت

صدمہ الم و یاس سے ہے جانِ حزیں پر
یہ کہکے دھنش پھینکدیا فرشِ زمیں پر

بھگوان نے ارجن کو جو دیکھا کہ ہے مایوس　　فرمایا کہ زندانِ خیالات کے محبوس
دل تیرا عبث خاک کے پُتلوں سے ہے مانوس　　دیکھ اُسکو جو ہے شمعِ پسِ پردۂ فانوس

وہ نورِ علیٰ نور ہے وہ رُوحِ رواں ہے
ہو جامۂ تن چاک تو کیا اُس کو زیاں ہے

اندیشۂ باطل سے ترا عقل سے خالی　　میداں میں ہے پست عبث ہمتِ عالی
تو خون کرے جنگ میں ہے خام خیالی　　ہے طُرفہ طلسمات یہ دُنیائے مثالی

مارے سے ترے کوئی یہاں مر نہیں سکتا
تو خاک کے ذرّے کو فنا کر نہیں سکتا

ناداں کیلئے مایۂ آفات ہے دُنیا　　دانا کے لئے جلوہ گہہ ذات ہے دُنیا
نیرنگِ نظر عکسِ خیالات ہے دُنیا　　کچھ بھی نہیں اور دارِ مکافات ہے دُنیا

دیکھ اسکے تماشوں کو تو شاہد کی نظر سے
ہوش اپنے نہ کھو خوابِ پریشاں کے اثر سے

جلوت کدہ مایا کا ہے یہ ہستیٔ موہوم　　اگیان میں موجود ہے اور گیان میں معدوم
در پردہ یہ اسرارِ حقیقت کا ہے مفہوم　　پابندِ علائق نہ ہو رہ صورت معصوم

دانا ہے تو رکھ بے غرض افعال سے مطلب
بھولے سے نہ ہو ثمرۂ اعمال سے مطلب

نشکام کا آدرش اگر پیشِ نظر ہو　　دامن ترا آلائش عصیاں سے نہ تر ہو
وا دیدۂ حق بیں ہو حقیقت کی خبر ہو　　بازیچۂ فانی میں دوبارہ نہ گزر ہو

پھر قطرہ و دریا میں نہ پردا رہے باقی
مٹ جائے دُوئی ایک ہی جلوا رہے باقی

جب تک ہے مگر سانس عمل کی ہے ضرورت　　آزاد نہیں کرم سے مٹی کی یہ مورت
نشکام سے لیکن رہے یہ کام کی صورت　　آئینۂ دل کو نہ لگے زنگِ کدورت

بے لوث کنول بنکے تو رہ بحرِ جہاں میں
کثرت میں ہو وحدت کی تجلّی دل و جاں میں

ارجن کے جو ہاتھ آ گیا یہ نسخۂ اکسیر — رگ رگ میں اثر کر گئی اس گیان کی تاثیر
میداں میں اٹھا لیے دھنش بان مہاویر — افواجِ مخالف کو کیا جنگ میں تسخیر

اپدیش سے گیتا کے ملی ہستیِ جاوید
ذرّے کو میسّر ہوئی ہم بزمیِ خورشید

اے کاش! ہو یہ فلسفہ آدرش ہمارا — جنّت سے بدل جائے جہنم کا نظارا
شمشیرِ حوادث سے نہ ہوں قلب دوپارا — پھر اوج پہ آئے برق ہو بھارت کا ستارا

ہنگامۂ ہستی میں ظفریاب رہیں ہم
روشن صفتِ مہرِ جہاں تاب رہیں ہم

منظومہ جولائی ۱۹۲۵ء

مہارانا پرتاب کی تلوار

غربت جو نصیب تھی وطن میں — دو بھیل مکیں تھے ایک بن میں
اک دوسرے کے انیس و ہمدم — فرزند و پدر تھے دونوں باہم
اک پیر تھا اک جوانِ شہ زور — نو عمر تھا ایک، اک لبِ گور
تھا پیرِ ضعیف مردِ دانا — گزرا تھا نظر سے اک زمانا

تھا تجربہ کار اوج و پستی — دیکھے ہوئے گرم و سردِ ہستی
خطروں میں وہ بارہا پڑا تھا — گھمسان کے معرکے لڑا تھا
پیشانی پہ زخم کھا چکا تھا — میدان میں نام پا چکا تھا
گزری ہوئی جتنی زندگی تھی — تلوار کی چھاؤں میں کٹی تھی
اِک روز یہ دونوں باپ بیٹے — تھے گھاس کے بستروں پہ لیٹے
دن بھر جو شکار میں رہے تھے — درماندہ وہ دوڑ دھوپ سے تھے
جھپکی جو پلک تو سو گئے وہ — آلودۂ خواب ہو گئے وہ
جس وقت کہ آدھی رات گزری — کچھ اور ہی واردات گزری
صحرا میں چلی کہیں پہ تلوار — سنّاٹے میں شب کے آئی جھنکار
چونکا ناگاہ پیرِ فرتوت — حیرت سے بن گیا وہ مبہوت
فرزند کو خواب سے جگایا — گزرا ہوا ماجرا سنایا
یہ دونوں ابھی تھے گرمِ گفتار — اتنے ہی میں اور دو ہوئے وار
آواز اُسی طرح سے آئی — یکساں جھنکار دی سنائی
کچھ سوچ کے دل میں مسکرا کر — بڈھے نے کہا یہ سر ہلا کر
پرتاپ کے ہاتھ سے مقرر — کھیلی ہے اجل کسی کے سر پر

یکساں جو پڑے ہیں ہاتھ تینوں — سر کٹ کے گرے ہیں ساتھ تینوں
لوٹے ہیں ضرور خاک پر تین — شانوں سے جُدا ہوئے ہیں سر تین
بیٹے نے کہا محال ہے یہ — یہ خواب ہے یا خیال ہے یہ
رانا کہاں دشتِ پُر خطر میں — آرام سے ہونگے قصرِ زر میں
رنواس میں محوِ خواب ہونگے — کیوں وقفِ صد اضطراب ہونگے
تاریکیِ دشت ہی ہے کیا کم — طُرّہ ہے پھر اُس پہ ہُو کا عالم
شب کو یہاں آئیں وہ پڑی کیا — جنگل میں ہے کام اس گھڑی کیا
بُڈھے نے کہا مجھے یقیں ہے — جو کہہ چکا اُس میں شک نہیں ہے
پرتاب کی تیغِ خوں فشاں کے — یہ وار ہوئے ہیں بانکے بانکے
لاکھوں میں چلی ہے تیغ رانا — کُشتوں کو اجل کا تھا بہانا
نکلی ہے جو بات میرے مُنہ سے — پتھر کی لکیر تو سمجھ لے
لڑکے کو مگر یقیں نہ آیا — شک دل میں بُری طرح سمایا
بولا وہ کہ خیر بات کچھ ہو — تحقیق کروں گا صُبح اس کو

جب لیلیِ شب کا دَور بدلا — نیرنگِ جہاں کا طور بدلا

جھونکے بادِ سحر کے آئے — گردوں کے چراغ جھلملائے
ڈوبے سرِ آسماں ستارے — ٹھنڈے ٹھنڈے وہ سب بچارے
اُٹھا وہ جواں بہت سویرے — لی دشت کی راہ مُنھ اندھیرے
آواز کا کچھ نشان لے کر — مسکن سے چلا کمان لے کر
ہر سمت کو دیکھتا ہوا وہ — صرصر کی طرح ہوا ہوا وہ
صحرا کو جو خوب چھان مارا — دیکھا عجب اِک جگہ نظارا
تھا دامنِ دشت خوں سے تر — لاشیں نظر آئیں تین بے سر
حیرت سے زمیں میں گڑ گئے پاؤں — سکتہ سا ہوا جکڑ گئے پاؤں
گم ہوش ہوئے یہ دم زدن میں — کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں
اُس سمت سے پھر نظر ہٹا کے — اوسان بجا کئے ہوا سے
رُخ اپنا جو آگے چل کے پھیرا — دیکھا اک شان دار ڈیرا
پہرے پہ کھڑے تھے ہر طرف بھیل — شہ زور۔ سیاہ رُو۔ گراں ڈیل
اِک بھیل کو آنکھ سے بُلایا — رازِ دلِ مضطرب سُنایا
گزری ہوئی واردات پوچھی — جسکی تھی کھٹک وہ بات پوچھی
بولا وہ یہ خیمہ راج کا ہے — رانا کا یہاں گزر ہوا ہے

کل رات کو چار دُزدِ چالاک   کیا جانے لگائے کب سے تھے تاک
تاریکیِ شب کی آڑ لیکر   داخل ہوئے خوابگہ کے اندر
لیکر زر و زیور و جواہر   خیمے سے چلے نکل کے باہر
آہٹ سی جو پاؤں کی سُنی تھی   رانا کی بھی آنکھ کھُل گئی تھی
اُٹھے وہیں تیغِ تیز لے کر   جا پہنچے وہ ڈاکوؤں کے سر پر
بھرپور جو تین ہاتھ مارے   تن سے سر تین کے اُتارے
چوتھے کو جو دیکھا ڈر رہا تھا   بِن مارے وہ آپ مر رہا تھا
رکھکر زر و زیور اُسکے سر پر   آئے سوئے خوابگہ مظفر
لے آئے چھُڑا کے مال و زر بھی   اور تینوں ڈاکوؤں کے سر بھی
یہ حال سُنا تو کھو گیا وہ   حیرانی سے زرد ہو گیا وہ
منزل پہ جو پہنچا دل شکستہ   بولا یہ پدر سے دست بستہ
اے واقفِ رازِ غیب دانی   آگاہِ رموزِ تیغ رانی
یہ آپ نے کس طرح سے جانا   کل شب کو چلی تھی تیغِ رانا
وہ پیرِ ضعیف ہنس کے بولا   یوں پردۂ راز اُس نے کھولا
تلوار کا قاعدہ ہے ایسا   یکساں نہیں پڑتے ہاتھ اصلا

کتنا ہی کوئی جری نہ کیوں ہو / ہوتے نہیں وار ایک سے دو
گر لاکھ ہیں چاق و چُست ہوگا / ہر وار یہ ہاتھ سُست ہوگا
پرتاب کو ہے یہ فخر حاصل / شمشیر زنی میں ہے وہ کامل
ہے اُس کے ہی ہاتھ میں یہ طاقت / قُدرت سے ملی ہے دستِ قُدرت
دس وار بھی وہ کرے جو پیہم / ہرگز نہ ہو ایک ایک سے کم
ہے ہاتھ کا اِس قدر وہ سچّا / چھوٹوں کو بھی ہو نہ وار چھوٹا
یکساں جو لگائے ہاتھ بھرپور / دُنیا میں ہے آج کس کا مقدور
کل رات کو تیغ جب چلی تھی / جھنکار جو آئی ایک سی تھی
بس میں نے اسی سبب سے جانا / چمکی ہے ضرور تیغِ رانا
یہ بات سُنی تو پورِ دلبند / بولا یہ پدر سے ہو کے خورسند

کب بات کی اپنی مجھ کو پچ ہے
جو کچھ کہا آپ نے وہ سچ ہے

(منظومہ جون ۱۹۱۸ء)

مشاہیرِ نظمِ اُردو

ولی سے ہوئی ابتدائے سخن — کہ مشہور ہے وہ خدائے سخن
ولی نے جو لی راہِ باغِ جناں — ہوا میر و سودا کا سکہ رواں
پھر انشا و جرأت ہوئے نامور — رہا اُن کے تاجِ سخن زیبِ سر
بندھی ناسخ آتش کی پھر وہ ہوا — کہ دونوں کا عالم میں شُہرہ ہوا
زمانے نے لی ایک کروٹ جو اور — ہوا غالب و ذوق و مومن کا دور
جما بعد ازاں رنگِ داغ و امیر — یہ دونوں ہوئے مہر و ماہِ منیر

(مثنوی) سخنداںِ کامل نسیم و حسن — فنِ مثنوی میں تھے یکتائے فن

(مرثیہ) ہوئے مرثیہ گوئی میں بے نظیر — ضمیر و خلیق و انیس و دبیر
نفیس اور مونس کا چمکا کلام — رشید اور جاوید نے پایا نام

(ڈرا) ڈراما نویسی میں مشہورِ عام — ہوا حشر و بیتاب و احسن کا نام

تغزل کے اب رنگ میں بے بدیل | ہیں شاعر ریاض اور بیخود جلیل
زبانوں پہ ہے باغ و سائل کا نام | صفی۔ نوح۔ شیدا و نائل کا نام
شفق۔ برہم و مضطر ہیں نازک خیال | جگر۔ غوث و ثاقب ہیں شیریں مقال
عزیز۔ احسن و یاس ہیں تر زباں | قمر۔ مہر و رونق ہیں شیوا بیاں
سخنور ہیں اطہر۔ دلگیر و رفیق | نسیم۔ اشرف و شاد۔ صادق شفیق
زلالی و بیباک مفتون و ابر | عطا ندرت و شوق۔ ارمان و صبر
شہیر۔ آرزو۔ حسرت و نظم و جوش | مبیں۔ برتر و شوق۔ آزاد و ہوش
دبیر۔ افسر و شمس و تاباں قرار | ضمیم۔ اصغر و محو و وحشت۔ بہار
وجاہت۔ اثر محشر و شوخ و ناز | یہ قید تعارف سے ہیں بے نیاز

تصوف میں مہر اور ساحر ہیں فرد | رہ معرفت کے ہیں یہ ہم نورد

جو ہے آجکل بر محل شاعری | جسے کہتے ہیں نیچرل شاعری
بنا اس کی ڈالی تھی آزاد نے | جلا دی تھی حالی سے استاد نے
سرور اور اکبر نے دی داد نظم | یہ تھے رنگ میں اپنے استاد نظم

اب اقبال و چکبست ہیں نامدار
نظر اور محروم ہیں سحر کار

فدا و وفا اختر و تاجور
رواں بیحر سیماب ہیں نامور

فلک اکبر و کیفیِ خوش کلام
حفیظ اور سالک ہیں مشہور عام

اب ان سے ہے تازہ دماغِ سخن
یہ ہیں برقِ گلچینِ باغِ سخن[۱]

منظومہ مارچ ۱۹۲۲ء

دلآویزیِ بسنت

کیا رُت ہے بسنت کی دلآویز
ہر موجِ صبا ہے کیف انگیز

افسردگی ہو رہی ہے کافور
دل ہیں مئے تازگی سے مسرور

رگ رگ میں ہے موجزن نیا خون
طرفہ ہے یہ تازگی کا مضمون

---

[۱] جس وقت یہ نظم لکھی گئی تھی۔ تغزل اور نیچرل شاعری کے زیرِ عنوان جن مشاہیر کے تخلص نظم کیے گئے ہیں سب حیات تھے۔ لیکن افسوس اب ان میں سے بعض اس جہانِ فانی میں موجود نہیں مگر اُن کا کلام اُن کی زندہ یادگار ہے۔ ۱۲

دل آمدِ فصلِ گُل سے ہیں شاد — یہ جوشِ نشاط ہے خدا داد
سردی کا سماں بدل چکا ہے — جاڑے کا شباب ڈھل چکا ہے
اب کس کو ہے آگ سے سروکار — ہے آتشِ گُل کا گرم بازار
رنگِ رُخِ گُل نکھر رہا ہے — صدقے زرِ گُل اُتر رہا ہے
پھُوٹیں نئی کونپلیں شجر میں — غنچوں کے نئی قبا ہے بر میں
سرسوں کے جو کھیت کا سماں ہے — غیرت دہِ کشتِ زعفراں ہے
ہر سُو ہے نیا بہار کا جوش — ہے شاخِ نہالِ خشک گُلپوش
غُنچوں میں ہے نازآفرینی — پھُولوں کی مہک ہے بھینی بھینی
ہے جلوہ حُسنِ رُوئے گُل میں — مستی کا اثر ہے بُوئے گُل میں

بُلبُل کے ہے عیش کا زمانہ
لب پہ ہے بسنت کا ترانہ

(منظومہ فروری سنہ ۱۹۲۴ء)

انگریزی ہندی اور فارسی نظموں کے ترجمے

ادائے شکر

مجھے حیاتِ اَبَد دیکے بزمِ امکاں میں ۔۔۔ تو پھونکتا ہے نئی روح جسمِ بیجاں میں
تہی تو کاسۂ عمرِ رواں کو کرتا ہے ۔۔۔ نئے سرے سے پھر آبِ بقا سے بھرتا ہے

مثالِ نَے مرا سازِ حیات دُنیا میں ۔۔۔ ہے ہمنفس ترا گلزار، کوہ، صحرا میں
تو ایسے رنگ سے نغمہ طراز ہوتا ہے ۔۔۔ کہ لفظ لفظ ترا دل نواز ہوتا ہے

تو پاک ہاتھ جب اپنے مجھے لگاتا ہے ۔۔۔ خوشی سے دل مرا پھولا نہیں سماتا ہے
لبوں تک آتا ہے وہ رازِ جوشِ ہستی میں ۔۔۔ برنگِ نغمہ جو پنہاں ہے سازِ ہستی میں

ازل کے دن سے ہیں رحمت کی بارشیں مجھ پر
ہیں روز فرطِ ترحّم سے بخششیں مجھ پر

بھرے ہیں دستِ طلب تو نے گنجِ نعمت سے
فراخ دست ہوں تیرے کرم کی وسعت سے

منظومہ فروری ۱۹۱۶ء (گیتا نجلی)

نغمۂ فطرت

جنبشِ لب ہے نزاکت سے اگر بار تجھے
دل میں دیتا ہوں جگہ میں تری خاموشی کو

شوق میں تارِ دل بھری رات مجسّم بن کر
ہمہ تن دیدۂ حسرت ہوں ہم آغوشی کو

جلوۂ صبح سے چمکیگا ستارا میرا
تیرگی رات کی جب نُور سے شرمائیگی

تیری آواز بھی پھر مثلِ شعاعِ خورشید
سات پردوں سے ضیا بن کے نکل آئیگی

ایک ایک حرف ترا ساز ترنّم بن کر
غیرتِ نغمۂ مرغانِ خوش الحاں ہوگا

گُل کھلائیگی نئے نغمہ نوازی تیری
غنچۂ خاطرِ ناشاد بھی خنداں ہوگا

منظومہ فروری ۱۹۱۶ء (گیتانجلی)

بُوئے خوش

جس دن کنول کا پھول کھلا تھا کنارِ آب — صد حیف اب بے خبر تھا میں سرگرمِ اضطراب
دامن مرا اٹا تھا گلِ نو بہار سے — دیکھا نہ اُس کی سمت مگر میں نے پیار سے

افسردگی سے یاس نے دل میرا بھر دیا — تڑپا کے خواب سے مجھے بیدار کر دیا
بادِ جنوب میں تھی وہ خوشبو ملی ہوئی — جس سے مجھے حصول عجب تازگی ہوئی

بجلی گرا گئی مرے دل پر جو بوئے گُل — بیتاب ہو گیا میں پئے دیدِ روئے گُل
جھونکا تھا بُوئے غیرتِ مشکِ تتار کا — سمجھا اُسے نفس میں عروسِ بہار کا

لیکن یہ کیا خبر تھی مرے روبرو ہے وہ — میں جس سے باغ باغ ہوں میری ہی بُو ہے وہ
جس سے مشامِ جاں کو طراوت حصول ہے — میرے ریاضِ دل میں شگفتہ وہ پھول ہے

منظومہ فروری ۱۹۱۶ء — (گیتانجلی)

عروسِ مرگ

"جس روز موت آن کے در کھٹکھٹائے گی
کیا پیشکش وہ گھر سے ترے لیکے جائے گی"

نذرِ اجل کروں گا متاعِ حیات میں — جانے نہ دونگا اُسکو کبھی خالی ہات میں
ثمرہ جہاں میں جو مری عمرِ رواں کا ہے — حاصل جو میری کشتِ بہار و خزاں کا ہے
وقتِ اخیر سامنے اُس کے دھروں گا میں
سب کچھ عروسِ مرگ پہ صدقے کروں گا میں

(منظومہ فروری ۱۹۱۶ء) (گیتانجلی)

ساعتِ سفر

اب وقت ہے کہ ناؤ میں پانی میں ڈال دوں — بیکار تا کجا لبِ ساحل کھڑا رہوں
فصلِ بہار باغ سے رخصت بھی ہو چکی — کافور روئے گل سے طراوت بھی ہو چکی

ہیں بارِ دوشِ آمدِ خزاں دیدہ پھول اب — میں محوِ انتظار کھڑا ہوں فضول اب

موجوں کے لب پہ جوشِ تلاطم سے شور ہے
طوفان سا بپا ہے وہ پانی کا زور ہے
اُس کُنجِ سایہ دار میں پانی کے متّصل
گرتے ہیں زرد برگِ خزاں ہوکے مُضمحل

اے دل تجھے خبر بھی ہے تو کس ہوا میں ہے
ہلکا سا اضطراب یہ کیسا صبا میں ہے
ہر موجِ بادِ ہے سے تجھے نغمہ سُنا رہی
وہ پار سے صدائے ترنّم ہے آرہی

منظومہ مارچ ۱۹۱۶ء (گیتانجلی)

حسرتِ نغمہ

تیرے گُن گانے کی حسرت کھینچ لائی ہے یہاں
میں بھی اک گوشہ نشیں ہوں تیری بزمِ ناز میں
آرزو اسکے سوا کیا ہے کہ یہ تارِ حیات
ڈُٹ کرے مدّ عا ملجائیں تیرے ساز میں

نیم شب کے معبدِ تاریک میں گھڑیال جب
ہر طرف تیری پرستش کی صلائے عام دے
اے مرے معبود! تو اُس دم مجھے اپنے حضور
نغمہ پردازی کا لُطفِ خاص سے پیغام دے

منظومہ فروری ۱۹۱۶ء (گیتانجلی)

رُوحِ فلسفہ

عقلِ دقیقہ رس سے تھا کل شب میں ہمکلام — پر تو فگن ہوئے تھے مرے دل میں خیال چند
میں نے کہا یہ عقل سے اے مایۂ علوم — بتلا کہ پوچھتا ہوں میں تجھ سے سوال چند
ہے یہ طلسمِ ہستیِ موہوم کیا بلا؟ — اُس نے کہا یہ خواب ہے یا ہیں خیال چند
میں نے کہا کہ حاصلِ ہستی ہے چیز کیا؟ — اُس نے کہا کہ دردِ سری اور وبال چند
میں نے کہا کہ زیرِ نگیں کس طرح ہو نفس؟ — اُس نے کہا ملیں جو اسے گوشمال چند
میں نے کہا کہ اہلِ ستم کون لوگ ہیں؟ — اُس نے کہا یہی سگ و گرگ و شغال چند
میں نے کہا کہ بحثِ خلائق ہے چیز کیا؟ — اُس نے کہا کہ بے سروپا قیل و قال چند
میں نے کہا کمال ہے اہلِ جہاں کا کیا؟ — اُس نے کہا کہ جمع کریں گنج و مال چند

میں نے کہا سنا مجھے خیام کا کلام
اُس نے کہا کہ پند ہیں یہ حسبِ حال چند

(منظومۂ جولائی ۱۹۱۷ء)

شہیدِ جفا

یہ شہرۂ آفاق انگریزی شاعر سر والٹر سکاٹ کی مشہور نظم کمنر ہال کا
برجستہ ترجمہ ہے ۔

دامانِ شب تراوشِ شبنم سے تر ہوا
اوجِ فلک پہ ماہِ مُبیں جلوہ گر ہوا
زرتار سقف و بام ہوئے کمنر ہال کے
زریں شعاعِ نور سے اک اک شجر ہوا

زیرِ فلک تھے ساکنِ بزمِ جہاں خموش
ہنگامۂ حیات کا ٹھنڈا ہوا تھا جوش
ہاں اک حسین غمکدہ کمنر ہال میں
یوں گرمِ آہِ نیم شبی تھی بصد خروش

"او سنگدل! ہوا تری اُلفت کا امتحاں
کس مُنھ سے تو نے دی تھی وفا کی مجھے زباں
کیا اس لیئے؟ کہ رنج سے گھُل گھُل کے میں غریب
دوُں شرمناک کنجِ اسیری میں اپنی جان

اب کیا ہوا وہ گرمیِ اُلفت کا اشتیاق
میں ہوں تری عروسِ ستم دیدۂ فراق
تیری بلا سے اب میں جیوں یا کہ جان دوُں
پلکیں بھی نم ہوں تری گر یہ نہ دل پہ شاق

وہ دن بھی کیا تھے رنج سے حاصل تھا جب فراغ ... میں تھی پدر کے خانۂ تاریک کا چراغ
تجھ جیسے بے وفا سے پڑا تھا نہ واسطہ ... اندیشۂ فراق سے دل تھا نہ داغ داغ

تاروں کی چھاؤں اٹھتی تھی نورِ سحر کے ساتھ ... ہنستی ہنساتی خندۂ گلہائے تر کے ساتھ
رہتی تھی محوِ نغمہ سرائی تمام دن ... میں گلعذار بلبلِ خستہ جگر کے ساتھ

اچھا جو میرا حسن نہ تھا اتنا دیدہ زیب ... جیسی کہ شاہدانِ محل ہیں نظر فریب
کیوں تو نے ڈورے ڈال کے پھیلایا دامِ عشق ... پابندِ غم کیا مجھے عارتگرِ شکیب

کیوں حرفِ آرزو مرے کانوں میں ڈالے ... دکھلائے سبز باغ فریبِ جمال کے
میری بہارِ حسن کو وقفِ خزاں کیا ... گلچینِ عیش دل کی مرادیں نکال کے

جس دن سے تو نے اپنی نظر سے گرا دیا ... غفلت شعار خاک میں مجھ کو ملا دیا
بے نور ہیں کنولِ گلِ رخسار زرد ہیں ... تو نے بہارِ حسن کو لوکا لگا دیا

میری طرح جو ہجر میں گھل گھل کے جان دے
اس طرح جذبِ شوق اگر بے اثر رہے
گھل جائے غم سے حسنِ مجسم بھی ہو اگر
طوفاں کی تاب کیا گلِ نوخیز لا سکے

شاہی محل سنا ہے کہ ہے جلوہ زارِ حسن
ہر ناز آفریں ہے وہاں تاجدارِ حسن
حورانِ شرق جو کہ ہیں صد رشکِ آفتاب
وہ بھی تو اُنکے سامنے ہیں شرمسارِ حسن

کیوں تو نے حسن کا یہ چمن زار چھوڑ کر
ہر گل بجائے خود ہی جہاں زینتِ نظر
مجھ ناشگفتہ پھول پہ ڈالی نگاہِ شوق
میرا جمال اُن کے برابر نہ تھا اگر

یوں جلوہ ریز حسن تھا میرا دیہات میں
تاروں کا نور جیسے ہو تاریک رات میں
قسمت جگائی کاش کسی ہموطن کی میں
انمول جانتا جو مجھے کائنات میں

لیکن عجب نہیں یہ مرا خام ہو خیال
شاید نہ ہو کسی کا تو دلدادہ جمال
ہوکر اسیرِ آرزوئے تاجِ زرنگار
مجھکو غمِ فراق میں کرتا ہے پائمال

او دشمنِ وفا! مگر اُف کیا گلا کروں
نخچیرِ غم ہوں کیوں نہ میں گھل گھل کے جان دوں
اُمیدِ عقدِ ملکۂ انگلینڈ تھی اگر
تو نے عبث کیے مرے ارمان غرقِ خوں

تو نے مری ادا پہ کیا دل نثار کیوں
پھر دیکے داغِ ہجر کیا سوگوار کیوں
لیکر بشوق حلقۂ آغوش میں مجھے
تڑپا رہا ہے آہ تغافل شعار کیوں

جاتی ہیں جب اِدھر سے حسینانِ خوش خرام
گن گن کے پاؤں دھرتی ہیں کرتی ہوئی سلام
حسرت سے دیکھتی ہیں مرا ریشمی لباس
کیا جانیں وہ کہ غم سے مرا کام ہے تمام

وہ سادہ لوح مجھ سے سوا خوش نصیب ہیں
ہیں آشنائے غم وہ خوشی کی حبیب ہیں
کیا جانیں وہ ہی خندہ و گریہ میں فرق کیا
غم دیدہ بیگمات سے بہتر غریب ہیں

ہیں سوختہ نصیب ہوں جلنے کے واسطے
گھل گھل کے سوزِ غم سے پگھلنے کے واسطے
شاخِ بریدہ ہوں میں خزاں دیدہ چمن
میری بہارِ حسن ہے ڈھلنے کے واسطے

ظالم! کیا ہے تو نے یہاں تک حزیں مجھے
تنہائی کا بھی لطف میسر نہیں مجھے
اس غمکدے میں تیری کنیزانِ شوخ چشم
ہر بات پہ دکھاتی ہیں چینِ جبیں مجھے

کل شب جو میں ستم زدہ محوِ خرام تھی
آئیں صدائیں کان میں کوسِ رحیل کی
کہنے لگیں وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس طرح
بیگم! قریب ہے ترے انجام کی گھڑی

اس وقت سب جہان ہم آغوشِ خواب ہے
میں ہوں شبِ فراق ہے اور اضطراب ہے
آنسو بھی آہ پونچھنے والا نہیں کوئی
ہاں اک رفیق شمعِ بچشمِ پُر آب ہے

رخصت ہوا قرار کلیجہ ہے پاش پاش
کوسِ رحیل کا ہے وہی شور دلخراش
آتی ہے اب یہی درودیوار سے صدا
بیگم! قضا ہے سر پہ کھڑی ہوشیار باش"

اس طرح وہ اسیرِ محن گرمِ آہ تھی
اُس غمکدے میں زار بحالِ تباہ تھی
لب پر ہجومِ نالہ تھا ہر ہر نفس کیساتھ
سُرخ آنسوؤں کے جوش سے چشمِ سیاہ تھی

ہونے نہ پایا تھا ابھی دامن سحر کا چاک ٹوٹا سکوتِ صبح اُٹھا شورِ دردناک
آئیں صدائیں شورشِ ماتم کی غل ہوا صد حیف کمنر ہال میں کوئی ہوا ہلاک

آثار سوگ کے نظر آئے اِدھر اُدھر ماتم میں تین بار بجا موت کا گجر
کر کے طوافِ غمکدۂ کمنر ہال کا زاغ و زغن نے شور کیا پھڑ پھڑا کے پر

غل مچ گیا دیہات میں کہرام ہو گیا اُجڑے درختِ سبز، غمِ عام ہو گیا
دم توڑتی تھی قیدِ محن میں جو نازنیں آج اُس ستم نصیب کا انجام ہو گیا

اب کوئی غمکدے کے پھٹکتا نہیں ہے پاس بے رونقی سے ہیں در و دیوار تک اُداس
جس روز سے یہ حادثۂ جانگزا ہوا ابتک ہے کمنر ہال پہ چھایا ہوا ہراس

ہوتے نہیں حسین وہاں محوِ ناز اب ہے اُس جگہ کے سائے سے بھی احتراز اب
اُڑتی ہے گرد جلوۂ گُل تھا جہاں کبھی کیا خاک ہو وہاں کوئی نغمہ نواز اب

گریہ کناں اُدھر سے گزرتے ہیں رہ نورد — اِس حادثہ کی یاد سے اُٹھتا ہے دل میں درد
پڑتی ہے کمنر ہال کے بُرجوں پہ جب نظر — بے ساختہ لبوں سے نکلتی ہے آہِ سرد

نشۂ حسن

اک حسینہ تھی رشکِ مہرِ منیر — حُسن کی جیتی جاگتی تصویر
اُس کی آنکھوں کا تھا عجب انداز — اُن میں تھا جلوۂ تبسّمِ ناز
وہ کرشمے نئے دکھاتی تھیں — جاگتے سوتے مُسکراتی تھیں
جس سے اُس کی نگاہ چار ہوئی — ایک برچھی سی دل کے پار ہوئی
اُس کی رعنائی کا تھا شہرۂ عام — ایک عالم تھا بندۂ بے دام
حُسنِ صورت سے تھا سرورِ شراب — اُس پہ طرّہ تھا عنفوانِ شباب
دو نشوں میں وہ چُور رہتی تھی — مستِ ناز و غرور رہتی تھی

عجب اک روز اتّفاق ہوا — جالا مکڑی کا اُس سے ٹوٹ گیا
اُس سے جالے کے تار جُڑ نہ سکے — کوششیں کیں ہزار، جُڑ نہ سکے

رہ گئی شرم سے خجل ہو کر　　بے بسی سے شکستہ دل ہو کر

ایک دن تھی وہ محوِ آرائش　　جامہ زیبی تھی صرفِ زیبائش
ہاتھ سے آئینہ جو چھوٹ گیا　　فرش پر گرتے ہی وہ ٹوٹ گیا
اُس نے پھر لاکھ جوڑ توڑ کیے　　ٹکڑے پر آئینہ کے جُڑ نہ سکے
رنگ فق ہو گیا خجالت سے　　دل میں شرمائی اپنی حالت سے
قلب صدمے سے پاش پاش ہوا　　خودنمائی کا راز فاش ہوا
اُس نے چھیڑا ترانۂ رنگیں　　جس سے ہو قلبِ زار کو تسکیں
غرقِ نغمہ مگر الم نہ ہوا　　بڑھ گیا اضطراب، کم نہ ہوا
جو حکومت دلوں پہ کرتی تھی　　جو زمیں پر نہ پاؤں دھرتی تھی
بیکسی پر وہ اپنی رونے لگی　　رُوئے صاف آنسوؤں سے دھونے لگی

نشۂ حسن کا اُتار ہوا
نازِ بیجا مٹا قرار ہوا

منظومہ مارچ ۱۹۲۴ء

مادرِ ناشاد کا خواب

اے مری آنکھوں کے تارے تو کہاں ہے جلوہ گر — چاند سی صورت تری آتی نہیں مجھکو نظر
فرطِ غم سے ہوں پریشاں حال میں تیرے لیئے — اشکِ خوں روتی ہوں میرے لال میں تیرے لیئے
تیرے ہی دم سے میسّر تھا مرے دل کو سرور — شکلِ زیبا تھی تری تسکینِ جانِ ناصبور
آہ میرے لال مجھکو داغ ہجراں دے گیا — تا دمِ آخر مجھے جلنے کا ساماں دے گیا
اے مرے نورِ نظر۔ اے مایۂ صبر و شکیب — میری آنکھوں میں ہے ابتک تیری شکلِ دلفریب
روتی ہوں آٹھ آٹھ آنسو تیری خاطر روز میں — کھینچتی ہوں تیرے غم میں نالۂ جانسوز میں
تو چراغِ خانماں تھا دل تھا پروانہ مرا — تیرے ہی دم سے منور تھا سیہ خانہ مرا
تیرا پیکر اب مجھے نقشِ خیالی ہو گیا — آہ میرا حلقۂ آغوش خالی ہو گیا
ہاتھ بھی تیرے نہ ٹوٹے آہ! اے گلچینِ اجل — تو نے میرا غنچۂ نوخیز توڑا بے محل
اسکو ہاتھوں چھاؤں میں رکھتی تھی مرگِ ناگہاں — کر دیا گل تیرے جھونکے نے چراغِ خانماں
روتے روتے سو گئی اک روز وہ ناشاد ماں — رات دن ماتم میں جو رہتی تھی سرگرمِ فغاں
اس کو اس دم اک فرشتہ خواب میں آیا نظر — کھل گئیں آنکھیں سی جس کا روئے انور دیکھکر
وہ فرشتہ یوں ہوا گویا کہ اے ناشادِ غم — کس کی خاطر ہو رہی ہے اسطرح بربادِ غم

کس کی فرقت کا ہے صدمہ جان ہے کس پر پڑی لگ رہی کس لیئے آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی
سرد آہیں کس لیئے بھرتی ہے تو اے غم نصیب چھُٹ گیا ہے تجھ سے آخر کونسا ایسا حبیب

بھر کے آہِ سرد یوں گویا ہوئی وہ بیقرار حالِ دل تجھ سے کہوں کیا غم سے سینہ ہے فگار
آہ گُلچینِ اجل نے مجھ پہ توڑا ہے ستم اُسکے ہاتھوں لُٹ گیا میرا گلستاں یکقلم
جل گیا میرا گُلِ رعنا خس و خاشاک میں مل گئیں افسوس میری آرزوئیں خاک میں

سُنکے یہ بولا فرشتہ اُس سے میرے ساتھ آ میں بتاؤں یوسفِ گم گشتہ کا تیرے پتا
پھر وہ اُس مہجور کو باغِ جناں میں لیگیا بلبلِ شیدائے گُل کو گلستاں میں لیگیا

دیکھتی کیا ہے۔ کہ ہے اک بوستانِ نوبہار جسمیں سر رُت کے شجر ہیں پھول پھل سے بار دار
کر رہی ہے عطر افشانی نسیمِ جاں فزا آ رہی ہے خندۂ گُل سے شمیمِ جاں فزا
زینت افزائے چمن گلہائے رنگا رنگ ہیں شاخِ گُل پر نغمہ زن مرغانِ خوش آہنگ ہیں
پھول ایسے خوشنما ہیں گلشنِ شاداب میں چشمِ نظارہ نے جو دیکھے ہونگے خواب میں
وسطِ صحنِ باغ میں ہے ایک دلکش سبزہ زار جا بجا ہیں محوِ گُل بازی ہزاروں شیر خوار

شوق سے ان پھول سے بچوں پہ دوڑائی نظر
پر نظر آیا نہ اُن میں اپنا آرامِ جگر

پھیر لیں آنکھیں اُدھر سے بادلِ حسرت طلب
دوسری جانب نظر ڈالی بصد رنج و تعب

دیکھتی کیا ہے وہاں ہے ایک ایوانِ بلند
اور اُترتا ہے اُسی سے نورِ دیدہ ارجمند

جوشِ اُلفت میں کلیجہ سے لگا یا دوڑ کر
لیں بلائیں اور دیئے بوسے جبینِ ناز پر

پھر کہا اُس سے کہ اے آرامِ جانِ بیقرار
جاں بلب تیری جُدائی سے ہوں میں سینہ فگار

رات دن ماتم میں شغلِ اشکباری ہے مجھے
تو جُدا جب سے ہوا ہے جان بھاری ہے مجھے

رنج کھانے کیلئے ہے اشک پینے کے لیئے
آب و دانہ ہے یہی فرقت میں جینے کے لیئے

تیرے غم میں چشم کو پرنم کیا کرتی ہوں میں
دستِ مژگاں سے ترا ماتم کیا کرتی ہوں میں

ہاں مرے نورِ نظر بہرِ خدا منہ سے تو بول
کیوں ہے دستِ نازنیں میں کھولتے پانی کا ڈول

اور بچے تو ہیں سب مصروفِ گلبازی وہاں
تو اسیرِ رنج و غم ہے کس لیئے تنہا یہاں

تجھ سے کیا ایسی خطا سرزد ہوئی ہے جانِ من
جس کی تو پاداش میں ہے یوں گرفتارِ محن

بھر کے آہِ سرد یوں بولا وہ طفلِ نازنیں
کیا بتاؤں کس بلا میں ہے مری جانِ حزیں

جان پر صدمہ ہے میری اشکباری سے تری
مضطرب ہے روح میری بیقراری سے تری

جوشِ اُلفت میں بہاتی ہے جو تو اشکِ رواں
فرطِ غم سے غیر ہوتی ہے مری حالت یہاں

یاد کرتی ہے جو تو ہوتا ہوں میں بھی بیقرار — کھینچتا ہے دلکو تیرا جذبۂ بے اختیار
آنکھ سے ٹپکے ہیں تیرے گرم آنسو جس قدر — قطرہ قطرہ جمع ہیں اس ڈول میں وہ سربسر

تو نہ رویا کر مرے ماتم میں اے ناشاد ماں — سونپ دے مجھکو خدا کے ہاتھ ہوکر شادماں
پھر نہ ہوگی روح میری جوشِ غم سے بیقرار — پھر دلِ مضطر نہ ہوگا یوں الم سے بے قرار

سُنکے بولی مادرِ ناشاد اے نورِ نظر — میرے رونے سے اگر صدمہ ہے تیری جان پر
اب نہ روؤنگی ترے سر کی قسم کھاتی ہوں میں — جبر کرکے اس دلِ مضطر کو سمجھاتی ہوں میں
تجھکو یوں راحت ملے تو اے گُلِ نخلِ مُراد — سونپتی ہوں میں خدا کے ہاتھ تجھکو شاد شاد

سُنتے ہی یہ پھینک کر بارِ گراں طفلِ حسیں — دوڑ کر پہنچا جہاں تھے گلرُخانِ نازنیں
ہوگیا وہ محوِ گلبازی بصد لُطف و خوشی — مادرِ ناشاد کے بھی کھل گئی دل کی کلی
کھُل گئی چشمِ تماشا خواب سے پھر ایک بار — پر نہ پہلو میں دلِ مُضطر کو پایا بے قرار

تا دمِ آخر مگر باقی رہی تاثیرِ خواب
نقشِ تسکینِ دلِ مُضطر ہوئی تعبیرِ خواب

منظومہ دسمبر ۱۹۰۸ء

ساعتِ مرگ

آتی ہے وقتِ خاص پہ گلزار میں خزاں　　ڈھلنے کا فصلِ گل کے مقرر ہے اک سماں
تارے ہیں تا ظہورِ سحر زیبِ آسماں　　پابندِ وقت کب ہے مگر مرگِ ناگہاں

دن بھر ہیں کاہشیں بسرِ اوقات کیلئے　　ہوتی ہے شام لطفِ ملاقات کیلئے
طاعت کے خواب کے ہیں مزے رات کیلئے　　ہر آن ہے اجل تری آفات کیلئے

معلوم ہے گھٹے گا مہِ تاب دار کب　　اور آئیں گے طیور سمندر کے پار کب
حاصل کریگی رنگِ خزاں کشتِ زار کب　　پر کیا خبر کہ تیرا کریں انتظار کب؟

کیا تیری وہ گھڑی ہے؟ کہ جب بادِ نو بہار　　پھولوں کو گدگداتی ہے شوخی سے بار بار
یا جب کہ گل کو ملتا ہے پژمردگی کا خار　　ان سب کا ایک وقت ہے لیکن ترے ہزار

تو ہے وہاں بھی موج اٹھاتی ہے سر جہاں　　یا ہے لبِ نسیم پہ نغمہ جہاں رواں

تو ہے ہمارے گوشۂ راحت میں بھی نہاں — دنیا میں تجھ سے بچکے اجل! جائیں ہم کہاں

اُس جا بھی تو ہے ملتے ہیں دو غمزدہ جہاں — ہونے کو زیرِ سایۂ اشجار تازہ جاں
تو اُس جگہ بھی ہے کہ جہاں تیغِ خوں فشاں — تاجِ شہی کی رن میں اُڑاتی ہے دھجیاں

منظومہ مارچ سنہ ۱۹۲۲ء

فریبِ ادا

ادا سے آئی وہ گلبن کے پاؤں دھرتی ہوئی — پلٹ گئی اُنہی قدموں سے ناز کرتی ہوئی
نسیم صبح کو دے کر پیامِ سرگوشی — وہ صاف کہہ گئی مفہومِ رازِ خاموشی
بنا گئی گُلِ تر راہ کے ببولوں کو — نہال کر گئی پامال کر کے پھولوں کو

بصد نگاہِ تجسس تلاش کی میں نے — کہ اُس کا رازِ دلی تاڑ لوں نگاہوں سے
لب اُس کے غنچۂ وابستہ تھے تبسم سے — لگی تھی مُہر گرانبارئ ترنم سے
جو جاتے جاتے نظر سوئے چرخ کی اُس نے — دیا جواب شعاعِ قمر نے بوسے سے

وہ اُسکے پاؤں کی آہٹ کا نغمۂ شیریں — دمِ خرام لبِ فرشِ سبزۂ رنگیں
جو یاد آتا ہے ہوتا ہوں محوِ حیرانی — کہ غم تھا یا کہ طرب اُسکا رازِ پنہانی
وہ جس طرح گئی اے کاش اُسی طرح آئے — نہیں تو خواب میں اپنی جھلک دکھا جائے

منظومۂ مارچ ۱۹۱۶ء (جذباتِ ٹیگور)

پھول

پھول کیا ہیں؟ دلِ مایوس کی اُمیدیں ہیں — یہ وہ الفاظ ہیں بچے ہیں شناسا جن کے
سب سے پیاری ہے یہ مخلوق مگر ربِّ قدیر — پھونکنی بھول گیا رُوح بدن میں اِن کے

ہم سے تو کرتے ہیں یہ پھول اشارے ہی فقط — آسماں اور خدا سے ہیں یہ محوِ تقریر
ہو کے آوارۂ دامانِ فضا نکہتِ گُل — اپنی شیرینی کی کرتی ہے دوبالا تاثیر
مست و بیتاب ہوا کرتی ہے یوں موجِ نسیم — جس طرح ساز کے نغموں کی صدائے دلگیر

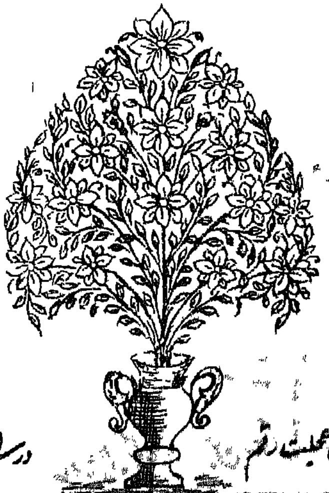
چرخ پہ تاروں میں بالائے زمیں پھولوں میں — نام لکھتا ہے قلمکارِ حقیقی اپنا
پھول ہیں نادرِ قدرت کی زبانیں گویا — جن سے کرتی ہے وہ اسرارِ محبت افشا

پھول کیا ہیں؟ یہ ہیں آسمانِ زمیں کے تارے
کیسے دلکش ہیں سُنہری ہیں یہ پیارے پیارے

اِس لیئے کھلتے ہیں کچھ پھول کہ خنداں ہو کر
بُوئے شیریں سے معطّر کریں بادِ صحرا
گُل وہ خوشیاں ہیں جہاں کی وہ گہرہائے اُمید
جو یہ کہتے ہیں ہمیں بھول نہ جانا اَصلا

پھول دیتے ہیں ہمیں عیش و مسرت کا پیام
جلوۂ حسن کا۔ موسیقی و نکہت کا پیام

(منظومہ فروری سنہ ۱۹۲۲ء)



سید معین الحسن جرجی علیگ رقم
در سنہ ۱۹۲۹ء تحریر نمود

تجلیاتِ برق

یہ شاعرانہ ناز کھیا ایونکی جان افتخار الشعرا جناب برق دہلوی کی معرکۃ
غزلوں کا دیوان ہے جس کا ہر شعر جذباتِ حسن و عشق کا افسانہ اور وجدانی نغمہ
کا معجز ترانہ ہے۔ زیادہ تعریف تحصیلِ حاصل ہے۔ اربابِ ذوق کو دعوتِ نظر دی
جاتی ہے۔ ع

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

یہ دیوان عنقریب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہوگا +

کرشن درپن

یہ بھی جناب برق کی روحانی سرور بخشنے والی نظموں کا ولآویز مجموعہ
ہے جو بھگوان کرشن کے پرستاروں کیلئے ارمغانِ نغمہ اور اہلِ ادب کیلئے لطیفہ
ادبی تحفہ ہے۔ پہلے ایڈیشن کی صرف دو سو جلدیں باقی ہیں۔ قیمت صرف ۲؍

ملنے کا پتہ:۔ منیجر آریہ بکڈپو نئی سڑک۔ دہلی